ڈاکٹر زاہد منیر عامر

شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب لاہور

آئینۂ کردار

ناشر: پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت
ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سنٹر،
پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، پاکستان

اشاعتِ اول: جولائی ۲۰۰۳ء

اشاعتِ ثانی: اگست ۲۰۰۳ء

مطبع:

قیمت: ۸۰ روپے

ISBN 969-7604-05-3

نیا ایڈیشن

آئینۂ کردار

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

دیباچہ طبع ثانی

ایک ایسے دور میں جب کہ کتابوں کی اوّلین اشاعت ہی برسوں تک ختم نہ ہوتی ہو، نہایت کم وقت میں کسی علمی کتاب کی اشاعتِ ثانی کی ضرورت پیش آجانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے، یہ کتاب گزشتہ ماہ چھپ کر شائع ہوئی تھی، محض ایک ماہ کے عرصے میں اب اس کا دوسرا ایڈیشن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، گویا ''آئینۂ کردار'' اپنے محتویات کے اعتبار ہی سے نہیں مقبولیت اور پسندیدگی کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز کتاب ثابت ہوئی، یہ بات ہم سب کے لئے افتخار کا باعث ہے۔

یہاں رئیس الجامعہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) ارشد محمود کا شکریہ بھی واجب ہے، شیخ زاید اسلامی مرکز کو ہر مرحلے پر جن کا تعاون حاصل رہا اور جنھوں نے اِس کتاب میں غیرِ معمولی دلچسپی اور پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے اِس کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی خواہش ظاہر کی۔

کتاب کی یہ اشاعتِ ثانی بھی دراصل انھی کے ایما اور تحریک کا نتیجہ ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس حُسنِ نیت کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ آمین!

۷/اگست ۲۰۰۳ء

جمیلہ شوکت

ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامی مرکز

پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

اُن کے نام
جن کی کج روی میرے لئے درسِ اَخلاق بن گئی

آئینہ دل صاف باید تا درو
وا شناسی صورتِ زشت از نکو

رومی

فہرست

صفحہ

چنین گفت رستم بہ اسفند یار
کہ کردار ماند زِ ما یادگار

فردوسی

دیباچہ

اخلاقیات کا علم اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان اس لیے اخلاقی تصورات کو کاغذ پر منتقل کرنے کا عمل نیا نہیں لیکن چونکہ زندگی ہمیشہ آگے بڑھتی ہے اور ہر دور میں اخلاقی تصورات کو اُجاگر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ہر دور میں اس موضوع پر تصنیف و تالیف کی ضرورت رہتی ہے۔ خاص طور پر اُمّتِ مسلمہ میں کہ جس کے پیغمبر نے اپنی بعثت کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل کو قرار دیا اور جن کے اخلاقِ کریمانہ کے باعث اہلِ عرب نے اسلام قبول کیا اور جہاں بان و جہاں آرا بن گئے۔

بدقسمتی سے اُمتِ مسلمہ گزشتہ کئی صدیوں سے ترقیء معکوس کے عمل سے گزر رہی ہے اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دراصل کرداری سطح پر اَخلاقی پہلوؤں سے عدم توجّہی اس کا بڑا سبب ہے ذاتی مفادات کا شعور اجتماعی اَخلاق کے تصورات کو دھندلانے کا باعث بنتا رہا ہے جس کے نتیجے میں اعلیٰ اَخلاقی تصوّرات سے ہمارا تعلق کم زور ہو گیا ہے۔

عزیز گرامی ڈاکٹر زاہد منیر عامر قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے دور میں جب کہ اعلیٰ اَخلاقی تصوّرات دھندلا رہے ہیں اور تصنیف و تالیف کا عمل بھی منفعت بخش موضوعات کا شکار ہو رہا ہے اعلیٰ اَخلاقی موضوعات پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کے نتائج دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یوں تو عوام ڈاکٹر زاہد منیر عامر کو ٹیلی ویژن کے ایک معروف میزبان اور مقرر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور مشغلے کے اعتبار سے وہ پنجاب یونی ورسٹی میں ادبیات کے استاد ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ محض ایک مقرر یا معلم ہی نہیں بلکہ ایک سنجیدہ فکر محقق اور دانش ور بھی ہیں اور متعدد علمی موضوعات پر ان کی تحقیقات شائع ہو کر اہل علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں اس کے ساتھ وہ ایک خوش فکر شاعر اور دو تین شعری مجموعوں کے خالق بھی ہیں۔ ان کے شاعرانہ میلان کا اظہار اَخلاقی موضوعات پر لکھی ہوئی ان کی زیر نظر کتاب سے بھی ہوتا ہے جس میں انھوں نے دینی اور اخلاقی مباحث میں نہایت خوب صورتی سے اُردو اور فارسی کے اشعار استعمال کیے ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فہم دین کی اساس فراہم کرنے کے لیے عربی شاعری کی تعلیم پر زور دیا تھا اور قرآن حکیم

کے نامانوس الفاظ کا مفہوم سمجھنے کے لیے قبل از اسلام کی شاعری سے استشہاد کی روش حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ہاں خاص طور سے نمایاں ہے، مقصود یہ ہے کہ زاہد منیر عامر کی یہ تحریریں بھی اِسی روایت کے تسلسل میں ادبیت اور شعریت کی حامل ہیں، خوبی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے مفہوم کو اسلوب پر غالب رکھا ہے۔

عامتہ المسلمین کی دینی و اَخلاقی تربیت شیخ زاید اِسلامی مرکز کے اہداف میں شامل ہے، یوں زیرِ نظر کتاب کی اشاعت سنٹر کے بنیادی مقاصد سے ہم آہنگ ہے، اس لیے میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب کی بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے شیخ زاید اسلامی مرکز کو ان تحریروں کی اشاعت کا موقع فراہم کیا۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے قارئین اپنے اندر اَخلاقِ فاضلہ کے لیے بے پناہ کشش محسوس کریں گے اور یہی اس کتاب کی تحریر و اشاعت کا مقصد ہے۔

وما علینا الا البلاغ

جمیلہ شوکت

ڈائریکٹر

شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

لاہور

۱۳ر مئی ۲۰۰۳ء

گُم شدہ کی تلاش

اگر یہ بات درست ہے کہ اخلاق، طاقت وروں کو نیچا دکھانے کے لئے کم زور لوگوں کی ایک اختراع ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں بد اخلاق سے بد اخلاق شخص، ظالم سے ظالم فرد یا حکومت اور بدترین ناانصافیاں کرنے والے بھی اپنے کاموں کے جواز کے لئے اخلاقی دلائل کیوں تلاش کرتے ہیں......؟ کج خلقوں، ظالموں اور ناانصافوں کی یہ تلاش ہی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اخلاق و کردار زندگی کی بنیادی اقدار میں سے ہیں، جنھیں گزرتے ہوئے وقت کے نقوش دھندلا نہیں سکتے۔۔۔

آج نفع وضرر کے عصری پیمانوں سے آشنا نوجوان جب یہ سوال کرتا ہے کہ حق وصداقت کے لئے قربانیاں دینے والے کرداروں کو دنیا سے کیا ملا......؟ تو اِس سوال کے پیچھے معاشرے سے اَخلاقی معیاروں کی گم شدگی یا زندگی کی حقیقت سے ناآشنائی کے سوا کچھ بولتا سنائی نہیں دیتا...... کیا یہ حقیقت نہیں کہ سچائی کے لئے قربانیاں دینے والے دنیا میں اَخلاقِ فاضلہ کی علامت بن چکے ہیں اور ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود ان کی حیاتِ جاوداں کو زمانے کی کوئی کروٹ دھندلا نہیں سکی، باقی دنیا کسی کو کیا دے سکتی ہے......؟ انسان ہی وہ بے مثل وجود لے کر دنیا میں آتا ہے جو اِس دنیا کو اعلیٰ تصورات کی روشنی سے منور کر سکتا ہے، بہ قولِ شاعر ؎

اہلِ کمال کو نظیر اہلِ جہاں نے کیا دیا
اہلِ جہاں کو کیا نہیں اہلِ کمال دے گئے

درحقیقت اَخلاقی تصورات اور کرداری پیمانے ہی وہ قوت ہیں جو تقدیر کے سربستہ راز کو منکشف کر سکتے ہیں اور زندگی کے لمحہ ءگزراں کو ابدیت عطا کر سکتے ہیں......یہی بنیادی خیال اس مختصر کتاب کی تحریر کے پسِ پردہ کارفرما رہا ہے......احقر کی دوسری اکثر تحریروں کی طرح یہ کتاب بھی ان داخلی تحریکات کا نتیجہ ہے جن کا مجھے گزشتہ برسوں میں سامنا رہا، میرے ذہن میں ابھرنے والے سوالات ہی نے مجھے ان تحریروں کے لئے قلم اٹھانے پر آمادہ کیا، معاشرے میں رہتے ہوئے زندگی کے نوبہ نو تجربات سے گزرتے ہوئے اور ہر روز نئے رنگوں اور نئے ذائقوں سے آشنا ہوتے ہوئے یہ تحریریں سینہ ءقرطاس پر رقم ہوئی ہیں، جنھیں کسی اِدّعا کے بغیر قارئین کی

خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ ہمارا معاشرہ بقائے اصلح (Survival of the fittest) کا قائل ہے..... اس تصور میں خرابی نہ تھی اگر اس کی بنیاد محض مادی اور حیاتیاتی نہ ہوتی، بقائے اصلح کا یہ مادی/حیاتیاتی تصور اخلاقی تصورات کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر آئینۂ کردار کو دھندلا دیتا ہے، میں نے ان تحریروں سے اسی زنگ کو دور کرنے کی کوشش کی ہے..... یہ زنگ جو مجھ سمیت سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔

اس کتاب کی اشاعت ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سنٹر پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ کی توجہ فرمائی کا نتیجہ ہے جس کے لئے میں اُن کا شکر گزار ہوں، تکمیلی مراحل میں مخدومِ گرامی ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب سے مفید مشورت اور راہ نمائی حاصل ہوئی جس کے لئے میں اپنے دل میں صمیمانہ تشکر کے جذبات پاتا ہوں۔ انھی کلماتِ تشکر کے ساتھ طالبِ علمانہ عجز وانکسار کا حامل یہ آئینہ خوانندگانِ کرام کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، اگر اس سے پھوٹنے والی کوئی کرن اذہان وقلوب کو منور کردے تو فھو المراد

وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ

زاہد منیر عامر

اورئینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

باب اوّل

اَخلاق اور سرگزشتِ اَخلاق

جسے خلق کیا گیا ہے اسے خُلق کی ضرورت ہے، حسنِ خُلق جو ہر انسانیت ہے، نفسِ انسانی کی وہ کیفیت جس میں افعال و اعمال کا صدور بلا تکلف ہو، اخلاق کہلاتی ہے، مراتب و درجات کا فرق اپنی جگہ مگر حیوان بھی اپنی ضروریات کے لئے کچھ ضوابط کے پابند ہیں...... اس حد سے آگے نہیں جاتے، انسانوں میں پست سے پست مشاغل رکھنے والوں کا بھی ایک ضابطہء اخلاق ہوتا ہے اور ناپسندیدہ و مغضوب اعمال کا صدور بھی اس ضابطے کے تحت ہوتا ہے اگرچہ اسے عرف عام میں ضابطہ اخلاق کہا نہیں جاتا آپ چاہیں تو اسے ضابطہء کج خلقی کہہ سکتے ہیں۔

اخلاقیات اور نفسیات کے علما نے انسان کے اعمال کو کرداری اعتبار سے تین امور یا کیفیات سے متعلق قرار دیا ہے: طبیعت، حال اور مَلِکہ

طبیعت انسان کی جبلّت ہے جو نا قابل تغیر ہے، انسان جن جبلی اوصاف کو لے کر دنیا میں آیا ہے وہ عمر بھر اس کے ساتھ رہتے ہیں، ختم یا تبدیل نہیں کیے جا سکتے۔

حال سے مراد نفس انسانی کی وہ کیفیت ہے جو اثر پذیر اور متغیر ہوتی ہے۔۔۔اس پر اثرات مرتب ہوتے اور پھر زائل بھی ہو جاتے ہیں۔

نفس انسانی کی وہ کیفیت جو رسوخ پانے میں کامیاب ہو جائے مَلِکہ کہلاتی ہے مَلِکات بھی تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن بالعموم ان میں تبدیلی دشوار ہوتی ہے۔

اخلاق کا تعلق مَلِکہ سے ہے۔۔وہ مَلِکات جو نفس میں رسوخ پا جائیں اور جن کے نتیجے میں اعمال وافعال بلاتکلف وتردّد صادر ہوں اخلاق کہلاتے ہیں۔

انسانی فطرت کا سرچشمہ شفاف ہے اور انسان اپنی سرنوشت اپنے قلم سے لکھ سکتا ہے۔ جب فطری قویٰ اپنی حدود میں رہ کر بدونِ لغزش عمل پیرا رہتے ہیں تو اخلاقِ حسنہ کہلاتے ہیں اور جب یہی فطری قوئی دائرہ توازن سے نکل کر افعال انجام دینے لگیں تو اخلاق سیّئہ بن جاتے ہیں۔ اگر نفس مسلسل فطری تقاضوں کی تکمیل دائرہ توازن سے نکل کر کرتا رہے تو پھر انسانی فطرت کا وہ سرچشمہ جسے قسّامِ ازل نے صاف وشفاف رکھا ہے گدلا بھی ہو جاتا ہے، اصولی طور پر کوئی جذبہ برا نہیں اور نہ ہی کسی جذبے کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اسے کچل دیا جائے، طبعی جذبات خاص مقاصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور یہی جذبات خاص تربیت سے حسنِ اخلاق بن جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ انسان کی طبعی کیفیات یا حالتیں ہی

جب تربیت وتہذیب کے عمل سے گزرتی ہیں تو اخلاقی حالتیں بن جاتی ہیں یا اس کے برعکس صورت ظہور میں آجاتی ہے۔

جہاں تک اخلاقیات کا بحیثیت ایک علم کے تعلق ہے، تو یہ بات اس کے دائرے میں نہیں آتی کہ اخلاقیات کا علم کسی شخص کے کردار و اخلاق پر اثر انداز ہو کر اس میں تبدیلی پیدا کر دے، محض علم، اخلاقی اوصاف کا شعور تو پیدا کر سکتا ہے مگر انھیں کردار کا حصہ بھی بنا دے؟ یہ ضروری نہیں، علم کے کردار کا حصہ بن جانے کی صورت یہی ہے کہ اسے کردار کا حصہ بنانے کا ارادہ کیا جائے اگر یہ ارادہ محکم بنیاد پر استوار ہو گا تو پھر کتابوں سے، اشخاص سے، ماحول سے، تجربے سے حاصل کیا ہوا علم کردار کی نظافت اور پاکیزگی کا سبب بنتا رہتا ہے ورنہ نہیں گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اخلاق کا علم اور تبدیلی کا ارادہ مل کر کردار کی تشکیل کرتے ہیں محض ارادہ بے معنی بات ہے اور محض علم لاحاصل۔

ارسطو کا خیال ہے کہ فطری خصوصیات کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور یہ خصوصیات اخلاقی پہلو سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں اس کے مطابق:

It is quite plain that none of the moral virtues is produced in us by nature, since none of the things with natural properties can be trained to acquire a different property. For example the stone, which has a natrual downward motion, cannot be trained to move upwards, not even if one "trains" it by countless upward throws. [1]

یہ طبیعت کا بیان ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا اور اس پر اتفاق پایا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ طبیعی جوہر کے اخلاقی اوصاف سے خالی ہونے کا بیان بھی ہے۔۔ گویا ایک خالی سلیٹ جو ہر نقش سے صاف ہے اور اس پر کوئی بھی نقش مرتسم کیا جا سکتا ہے اور اس ارتسام کے لئے ارادہ، محنت، کوشش اور کاوش شرط ہے اور یہی کوشش و کاوش انسانی فضیلت و امتیاز کا سبب بنتی ہے اور بقول ارسطو "فضیلت کے لئے صرف اس قدر جان لینا ہی کافی نہیں کہ وہ کیا شے ہے بلکہ اس سے زائد اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے مثلاً اس کے قیام و حفاظت کے لئے ریاضت، اس کا روزمرہ کے کاموں میں استعمال اور اسی قسم کے دوسرے وسائل و اسباب کی ایجاد تا کہ یہ سب باتیں مل کر ہم کو صاحب فضیلت اور نیکو کار بنا سکیں۔" ۷

صاحب فضیلت اور نیکو کار بننے کے لئے ریاض کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ایسا کر لینے سے انسان معاشرے کے لئے مفید ہو جاتا ہے لیکن یہ تو محض افادی پہلو ہے اور بہت سے لوگ افادی پہلو کو خاطر میں نہیں لاتے۔۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اخلاق، ایک معاشرتی افادی ضرورت ہے یا اس سے زائد بھی اس کی کچھ اہمیت ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اخلاق بلاشبہ افادی پہلو رکھتا ہے لیکن اس کا تعلق محض خارج سے نہیں ہے اخلاق دراصل جذبات و احساسات کے تسویے اور تطہیر کا نام ہے۔۔ اور خود انسان کے اندر اتنے متخالف و متضاد جذبات و احساسات موجود ہوتے ہیں کہ اگر ان کی تطہیر نہ کی جائے تو انسان کی اپنی ذات ہی جنگ و جدل کا شکار

ہو جائے اور انسان زندگی کے مطالبات کو پورے کرنے کے قابل نہ رہ سکے گویا اخلاق محض خارجی ضرورت نہیں بلکہ ذات کی وحدت و بقا اور اس کی متوازن نشو ونما کے لئے بھی اخلاقی تربیت کی ضرورت ہے اور جب ذاتی اخلاق راست اور متناسب ہو جائیں تو پھر خارجی سطح پر زندگی اور معاشرے کے مطالبات سے نپٹنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے اور فرد خود کو انسانی اوصاف سے متصف کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

کوئی شخص اگر اپنے اخلاق کے حسن و قبح کو جاننے کا خواہش مند ہو تو فطرت نے اسے ایسے پیمانوں سے متصف کر رکھا ہے کہ جن پر اپنے اعمال کو پرکھ کر وہ اپنے خلق کے حسن و قبح کا خود فیصلہ کر سکتا ہے یہ پیمانے ضمیر کی آواز، دوسروں کے ساتھ رویّے کو اپنے اوپر قیاس کرنا اور قرآنی اصطلاح میں نفسِ لوّامہ کی آواز سننا ہیں۔ جو انسان کو خوبی اور خرابی پر متنبہ کرتا رہتا ہے بشرطیکہ کثرتِ شر نے اسے افسردہ نہ کر دیا ہو۔ ضمیر کی افسردگی کا باعث مسلسل شر کے راستے پر گامزن رہنا بھی ہو سکتا ہے اور ماحول کی خرابی بھی بلکہ اکثر صورتوں میں ماحول کی خرابی، شر کا راستہ کشادہ کر دیتی ہے، بعض اوقات خاص ذہنی اور جسمانی امراض بھی حسنِ خلق سے محرومی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اگر ہم سقراط کے نظریہ علم کو پیش نظر رکھیں تو پھر جہالت اور بے علمی سوء خُلق کا سب سے بڑا باعث ہے۔

اس نے علم کی قدرت اور انسانی کردار پر اثر اندازی کے بارے میں کہا:

Knowledge is something noble and able to govern man, and that whoever learns what is good and what is bad

will never be swayed by anything to act otherwise than as knowledge bids, and ..... intelligence is a sufficient suceor of mankind. 3

سقراط کے نزدیک کوئی شخص گناہ (یا یہاں بداخلاقی کہہ دیجئے) کا ارتکاب اس لئے نہیں کرتا کہ اسے گناہ سے محبت ہوتی ہے بلکہ وہ اپنی جہالت کے باعث مبتلائے گناہ ہو جاتا ہے۔ سقراط کے نزدیک علم فطرتِ انسانی میں ودیعت کیا ہوا جوہر ہے، بعد کی سرگرمیوں کے باعث جس کا نقش دھندلا جاتا ہے اور ہماری حصولِ علم وکردار کی مساعی دراصل اسی گم شدہ جوہر کی بازیافت کی شکلیں ہیں۔ اس نے فیڈو میں سیمیاسن کا جواب دیتے ہوئے کہا:

جو علم ہمیں پیدائش سے پہلے حاصل تھا اگر وہ ہماری پیدائش کے وقت ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور بعد میں حواس کے استعمال سے ہم نے اس کی بازیافت کر لی تو کیا یہ عمل جسے ہم سیکھنا کہتے ہیں محض ہمارے فطری اور پیدائشی علم کی بحالی نہ ہوگا اور کیا اسے بجا طور پر بازیافت نہیں کہا جا سکے گا......؟ 4

سقراط کے اس نظریہ علم کو بعد کے فلاسفہ نے کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ان کا خیال ہے کہ اگر علم خیرِ محض ہوتا تو پھر انسان علم رکھنے کے باوجود ترغیباتِ نفس کا شکار نہ ہوتا۔

سقراط کے نظریہء علم کے بارے میں جان گولڈ نے جو تنقیدی زاویہ پیش کیا ہے جیرلی موس زینوفان کے خیال میں وہ کم سے کم خطا آمیز ہے 5 جان گولڈ کا کہنا

ہے کہ:

Socrates was wrong in supposing that if a man achieved an understanding of what justice involves, he would necessarily become just in behaviour, since the whole problem of choice intervenes between knowledge and action. 6

لیکن ہمارے نزدیک سقراط کا علم کو خیر محض کہنا اس لیے بجا ہے کہ عرفان کے بغیر علم، علم کہلانے کا حق دار نہیں ہے، وہ محض معلومات ہیں یا ہنر یا مہارت یا کچھ اور...... علم کو علم اس صورت میں کہا جائے گا جب اس کے مقتضیات انسانی کردار کا حصہ بن کر چھلکنے لگیں...... اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر شخص موصوف کو عالم نہیں ماہر کہا جائے گا...... گویا علم، خیر ہے اور قدیم مشرقی تصور کے مطابق روشنی۔

کم و بیش یہی تصور بدھ مت اور جین مت میں بھی پایا جاتا ہے، بودھی دھرموتار نے اپنی شرح نیائے ہندو میں کہا ہے کہ:

"پس علم افادی معلوم ہوتا ہے اور عوام الناس اسی کی تلاش میں رہتے ہیں صحیح علم کی ماہیت کی جانچ فلسفے کا کام ہے، علم کی واقعی آزمائش یہ ہے کہ وہ ہمارے حصول مقصد میں امداد کرے" 7

اس نظریے میں اگرچہ مقاصد کی خیر متعین نہیں تاہم علم کا مقام ضرور متعین ہے جینی اصحاب بھی بالعموم اسی نظریے کے موید ہیں ان کا خیال ہے کہ:

علم کی قدر خود علم کی خاطر نہ جانچی جائے، کسی چیز کی صحت (پرامانیہ) اس امر

پر مشتمل ہے کہ وہ براہِ راست حصول خیر اور اجتناب شر میں ہماری معاونت کرتا ہے صرف علم ہی میں یہ استعداد ہے کہ ہم خود کو اپنے ماحول کے مطابق بنا سکتے ہیں اور کوشش کر سکتے ہیں کہ خیر حاصل کریں اور شر سے بچیں۔ 8

یہاں تک کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ اخلاق کا جوہر علم ہے۔ اور علم اگر کردار و اخلاق کی تعمیر کسی روشن اساس یا بنائے خیر پر نہیں کرتا تو وہ شر ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا اخلاق بنائے فاسد علی الفاسد کا مصداق ہے۔

حدیث نبویؐ کی رُو سے علم تین قسم کی باتوں میں منحصر ہے اور ان سے بڑھ کر جو کچھ ہے محض زائد ہے اور وہ تین باتیں ہیں: آیہء محکمہ، سُنّتِ قائمہ اور فریضہء عادلہ؛

اَلعِلمُ ثلاثة و ماسوی ذلك فهو فضل: آية محكمة أو سنة قائمة او فريضة عادلة 9

اب ہمارے ماقبل کے مبحث سے متعلق قرآن حکیم کی ایک آیت ملاحظہ فرمائی جائے جس سے علم صحیح اور قیّم حاصل ہوتا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کے بنائے کو بدلنا نہیں یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے 10

سُنّتِ قائمہ تک پہنچنے کا ذریعہ حدیث ہے، حدیث آیہء محکمہ کی توضیح کرتی ہے:

مَامِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْیُنَصِّرَانِہٖ اوْیُمَجِّسَانِہٖ

ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔ !!

انسانی کردار و اعمال کا مصدر و منبع انسان کا دل ہے ۔۔ صوفیا و اذکیا کے نزدیک تو قلب کی یہ حیثیت بلا شک وشبہ اساسی ہے لیکن فہم عامہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ انسانی اعمال کے صدور کا جتنا تعلق قلب سے ہے کسی اور سے نہیں تمام تصورات وافکار دل کے سرچشمے سے جنم لیتے ہیں، اگر یہ سرچشمہ گدلا ہے تو پھر افکار و اعمال کو گدلاہٹ کا شکار ہو جانے سے کون روک سکتا ہے اور اگر یہ سرچشمہ شفاف ہے تو پھر سلامتی طبع محفوظ و مامون ہے سلامتی طبع کا محفوظ و مامون ہونا خیر پر منتج ہوتا ہے، بشرطیکہ نفسِ لوّامہ کی طرح اس صلاحیت کو کثرت شر کے باعث افسردہ نہ کر دیا گیا ہو۔

طبیعی کیفیات و حالات مختلف ہوتے ہیں اور جیسی حالت و کیفیت ہو نتیجہ ویسا ہی نکلتا ہے غزالی نے طبیعتوں میں خلق وعادات کی تبدیلی کے اعتبار سے انسانوں کے چار مراتب بیان کیے ہیں:

ایک تو وہ انسان ہے جو حق و باطل اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے ہی سے قاصر ہے، دوسرا وہ جو بد عملی کی برائی اور قباحت کو جانتا ہے لیکن اس نے خود کو نیک عمل کا عادی نہیں بنایا، تیسرا وہ جو بدی ہی کو عین حق وصواب سمجھے بیٹھا ہے اور چوتھا وہ جس نے بد اعتقادی اور بد عملی کے ماحول میں جنم لینے کے بعد ظلم و فساد ہی میں اپنی

سلامتی اور عافیت سمجھی اور دوسروں کے قتل و غارت ہی کو مایہ فخر و امتیاز اور موجب ازدیادِ مرتبت سمجھا۔ [12]

ان میں سے ہر ایک کے علاج کی اپنی دشواریاں ہیں، پہلا شخص سب سے زیادہ قابل علاج ہے اسے راہ نمائی کی ضرورت ہے جو اندھیرے سے نکال کر اسے اُجالے میں لے آئے دوسرے کو اپنے اندر تبدیلی کا خود عزم کرنا ہوگا تاکہ وہ خرابی کے چُنگل سے نکل آئے تیسرے کی اصلاح دشوار ہے کیونکہ خرابی نے اس کے دل میں جڑ پکڑ لی ہے اور اس کا تصورِ اخلاق مسخ ہو چکا ہے اور چوتھا نہایت کٹھن مرحلے سے دوچار ہے اور اس کی اصلاح بھیڑیے کو مودّب بنانے کی کوشش کی مانند ہے۔ [13]

اب ان تمام صورتوں میں اصلاح احوال کی مساعی کے مدارج بھی مختلف ہوں گے تاہم ایک امر جس کی طرف پہلے توجہ مبذول کروائی جا چکی ہے سب میں مشترک ہے یعنی: ارادہ وہ ریاضت جو خود کو بدلنے کے لئے درکار ہے ان میں سے اگر کوئی بھی شخص اخلاقیات کے علم اور اس کے فوائد پر اطلاع پالے تو اس سے اس کی زندگی میں کسی خاص تبدیلی کی توقع نہیں سوائے اوّلین استثنا کی صورت کے، البتہ اگر کوئی اخلاقیات کی اطلاع پانے کے ساتھ تبدیلیٔ اخلاق کا ارادہ بھی کر لے تو پھر تبدیلی کا امکان روشن ہو جاتا ہے۔

قسامِ ازل نے انسان کے اعضاء و جوارح کو مختلف وظائف کے لئے پیدا کیا ہے مثلاً ہاتھ اشیا کو گرفت میں لینے کے لئے، آنکھ دیکھنے کے لئے، کان سننے کے لئے، قدم چلنے کے لئے، ناک سونگھنے وغیرہ کے لئے، علیٰ ھذا القیاس اگر ان میں سے کسی

ایک عضو سے بھی اس کا خاص عمل چھین لیا جائے، ہاتھ کو باندھ کر، آنکھ کو ملفوف کر کے، قدموں کو جکڑ کر یا ناک کو لپیٹ کر ان کے وظائف سے محروم کر دیا جائے تو اذیت و نااطمینانی کا نتیجہ ہی نکلے گا اور اگر یہ اعضا و اوصاف مسلسل اپنے وظائف سے محروم رکھے جائیں تو رفتہ رفتہ ان کی صلاحیتیں بھی زنگ آلود ہو کر سمٹ سکتی یا ختم ہو سکتی ہیں، یہی حال دل کا ہے، دل کا وظیفہ بہ قول غزالی:

''علم و حکمت اور معرفت اور محبت اور عبادتِ الٰہی ہے'' [۱۴]

اب اگر دل اپنے پیش نظر انھی مقاصد کو رکھے گا تو زیادہ اپنی خلقت کی غایت کو پانے میں کامیاب ہوگا اگر اس کے پیش نظر ان مقاصد کے سوا کچھ مقاصد آ جائیں گے تو نہ صرف یہ کہ وہ رافت و رحمت سے محروم ہو جائے گا بلکہ اپنے مقصد سے ہٹ کر گم کردہ راہ بھی ہو بیٹھے گا۔

یہاں پہنچ کر اخلاق کی بحث نصب العین کے دائرے میں قدم رکھتی ہے، دل اگر بلند نصب العین کا حامل ہوگا تو اخلاق زیادہ بلند اور وسیع ہوں گے اور اگر دل کے پیشِ نظر مقصد یا مقاصد پست اور کوتاہ ہوں گے تو اخلاق پست اور کوتاہ واقع ہوں گے، یہ الگ بات ہے کہ مقاصد یا آرزو جس قدر بلند ہوں گے، فرد کو ان کی اتنی ہی زیادہ قیمت بھی ادا کرنی پڑے گی۔

نصب العین اگر ذاتی اور محدود ہوگا تو اس سے جنم لینے والے اخلاق بھی ذاتی اور محدود ہوں گے، اگر نصب العین کا دائرہ ملک و ملت تک پھیلا ہوگا تو اخلاق بھی اسی دائرے کے بقدر وسعت پا جائیں گے اور اگر نصب العین ذات و ملک کے دوائر

سے بھی آگے نکل کر بین الاقوامیت کے دائرے میں قدم رکھنے والا ہوگا تو پھر انسان اَخلاقیات کے بلند ترین مقام پر فائز ہو جائے گا۔

ذاتی نصب العین اپنے سوا کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتا لہٰذا ذات کی حدود سے آگے دیکھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، قومی نصب العین اپنی قوم اور اپنے ملک کی سرحدوں سے آگے اپنے معیاروں سے دستبردار ہو جاتا ہے جبکہ بین الاقوامی یا آفاقی نصب العین ہی وہ نصب العین ہے جسے اختیار کر لینے سے انسان اَخلاقِ فاضلہ کا حامل بن سکتا ہے۔۔ ورنہ ذاتی و قومی اَخلاق کے نتائج تو ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ ترقی پذیر معاشروں میں وہ افراد جو زندگی کی ذاتی سطح/انفرادی سطح سے بلند نہیں اپنے ہی ہم عنانوں کے حقوق غصب کر لینے کے لیے تیار بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ قومیں جو بظاہر مہذّب اور تعلیم یافتہ ہوتی ہیں مگر وطنیت کا محدود تصوّر رکھتی ہیں، وطنی حدود سے آگے کسی اَخلاقی ضابطے کی پاسداری نہیں کرتیں، زمانہء حال کی ترقی یافتہ قومیں بعض بے وسیلہ ممالک کے ساتھ جس سلوک کا مظاہرہ کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں اس سے ان کے قومی اَخلاق کی اس پستی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے جو بین الاقوامی دائرے میں قدم رکھتے ہی اس کا مقدر بن جایا کرتی ہے۔

دنیا کے تمام قومیتی نظریے، قومی اَخلاق کو جنم دیتے ہیں۔ یہ مذہب ہی ہے جو بنی نوع انسان کو ایک گروہ کے روپ میں دیکھتا اور اس کے ساتھ اسی حوالے سے یکساں اَخلاقی رویّے کی تمنا کرتا ہے۔۔ مذہبی اَخلاق پر بات کرنے سے قبل ضروری ہے کہ دنیا میں اَخلاقیات کے سفر کی روداد پر ایک نظر ڈالی جائے تا کہ اس کے تسلسل

میں مذہبی اَخلاق کا مقام متعین کرنے میں آسانی ہو۔

انسانی تاریخ میں اَخلاق کی داستان، اتنی ہی قدیم ہے جتنا خودانسان۔۔ ہبوطِ آدم کے وقت ہی کچھ اَخلاقی ضوابط متعین دکھائی دیتے ہیں۔۔ پھر فردوس کی گم شدگی کی داستان سلبی انداز میں کچھ ضوابط واحکام کی پابندی کی تلقین کرتی ہے...... قابیل وہابیل کا قضیہ اور حادثہ، کچھ اَخلاقی قیود کی نشاندہی کرتا ہے......اس کے بعد حضرت نوحؑ کی اپنی قوم کو تلقین کہ:

اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوۡهُ وَ اَطِيۡعُوۡنِ

ترجمہ: اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو [15]

اور پھر انھیں چاند سورج اور آسمانوں کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے یہ کہا:

اَلَم تَروۡ كَيۡفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقاً ۝ وَّجَعَلَ الۡقَمَرَ فِيۡهِنَّ نُوۡرًا وَّجَعَلَ الشَّمۡسَ سِرَاجاً

ترجمہ: کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا [16]

دراصل انھیں ایک خاص اَخلاقی ضابطے کی تلقین ہی کی صورت تھی، اس کی تفصیل آئے گی، اس تلقین پر کان نہ دھرنے کا نتیجہ طوفانِ نوح کی صورت میں نکلا گویا جس اَخلاقی ضابطے کی یہاں بات کی جارہی ہے اس کے عدم لحاظ نے زندگی کا چراغ بجھادیا۔ طوفانِ نوح کے بعد تاریخ عالم کا اہم دور یونان کے حکمت وفلسفے پر مبنی ہے،

سوفسطائیہ گو بعد ازاں جماعت الحمقا کہلائے لیکن انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے ساڑھے چار سو سال قبل علم الاخلاق کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، ان کی کاوشوں سے اَخلاق، فلسفے کا مستقبل موضوع بن گیا۔

سقراط جس کا زمانہ ۴۶۹ق م سے ۳۹۹ق م تک ہے اپنے عہد کا بڑا معلّمِ اَخلاق تھا اس نے علم کو خیر قرار دیا اور اس کے افکار میں اَخلاق نے علم کے نتیجے کا مقام حاصل کیا، سقراط نے علم اور اَخلاقیات کی دنیا میں ایک مستقل دبستان کا مقام پایا اور اس سے متاثر ہونے والوں کے کئی مکاتب فکر پیدا ہوئے جن میں اگر ایک جانب لذّت کوشی کو زندگی کے مسائل کا حل قرار دینے والے قورنیائی بھی تھے تو دوسری طرف لذت سے کامل اجتناب اور اذیّت کوشی کو پسند کرنے والے کلبی بھی۔

سقراط کے تلامذہ میں افلاطون اور اس کے افکار نے خاص شہرت حاصل کی افلاطون کا زمانہ ۴۲۷ ـ ۳۴۷ق م ہے، اس نے سوفسطائیوں کے حب الوطنی کے تصور پر تنقید کی اور اپنا مشہور تصورِ اعیان پیش کیا، جسمِ خاکی کے تلے جسمِ مثالی کے اس تصور نے بہت قبول حاصل کیا اور اَخلاقیات کی دنیا سے ادب وشعر کی دنیا تک اس کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔

افلاطون کے بعد مشائین اور ان کے پیشوا ارسطو (۳۸۴ـ۳۲۲ق م) کا دور آیا ارسطو کو افلاطون کے محضرِ علم سے استفادے کا موقع ملا تھا اس نے اَخلاق پر اپنی مستقل تصنیف میں سعادت کا تصور پیش کیا اس کے خیال میں عقلی قویٰ کا بہترین استعمال انسان کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔

ارسطو کے بعد اس کے تلامذہ مشائین اور پھر رواقیین اور کلبیین نے اپنے اپنے اَخلاقی تصوّر پیش کیے۔ روم اور یونان کو متاثر کرنے والے ان بڑے فلاسفہ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ یونانیوں کے فلسفے کا اصلِ اصول حکمت و تعقّل تھا اللہ کے نبی کے ظہور نے علم واَخلاق کا مرکز ثقل تبدیل کر دیا اور اب تمام علوم کی اصل وحی الٰہی قرار پائی اور اس کی روشنی میں نیکی وخرابی اور اچھائی برائی کے پیمانے طے پائے۔ حضرت عیسیٰ ؑ نے اپنی قوم کو حکمت کی تعلیم حکمت کے ساتھ دی:

وَلَمَّا جَآءَ عِیسٰی بِالۡبَیِّنٰتِ قَالَ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِالۡحِکۡمَةِ وَلِاُبَیِّنَ لَکُم بَعۡضَ الَّذِی تَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡهِ ج فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوۡنِ ط اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیۡ وَ رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ط

اور جب عیسیٰ ؑ صریح نشانیاں لئے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ ”میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب ہے اور تمھارا رب بھی، اس کی تم عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے [۱۷]

جب حضرت عیسیٰ ؑ کی تعلیم اَخلاق دھندلانے لگی تو اس نے آگے چل کر ایک نیا رنگ اختیار کر لیا جس نے رہبانیت نام پایا اور حصولِ اَخلاق ترکِ معاصی کے لئے ترکِ دنیا پر منحصر قرار پایا، چونکہ حضرت عیسیٰ ؑ، حضرت نوح ؑ اور حضرت ابراہیم ؑ کے بعد آنے والے سلسلہء رسل میں آخری رسول تھے [۱۸] اس لئے ان کے اثرات

ظہورِ اسلام سے قبل تک بلکہ اس کے بعد بھی جاری ہے اگر چہ ان کے حقیقی اثر کی عمر دو صدیوں سے زیادہ نہ تھی جس کے بعد رہبانیت کے تصور نے عیسائیت تو کیا خود مذہب ہی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی۔

یونانیوں نے اخلاق کو حکمت و دانش مندی پر موقوف قرار دیا تھا تو عیسائیت میں وحی الٰہی اور اللہ کی محبت کے لئے ریاضت نے اس کی جگہ لے لی۔ اور یہیں سے فلسفہ اور مذہب کی راہیں جدا ہوئیں۔

مسیحی دور کے بعد گو اخلاق و دانش کا چراغ فروزاں نہ رہا لیکن اس کی چمک یہاں وہاں اپنا رنگ دکھاتی رہی خاص طور سے عرب کے معاشروں میں بعض دانش وروں اور شعرا کے ہاں اخلاقی تصوّرات و تعلیمات اپنی جھلک دکھاتے رہے، مثلاً اکثم بن صیفی کے مقالات یا زہیر بن سلمٰی اور حاتم طائی کی شاعری اور علی الخصوص حکیم لقمان کے ہاں اخلاقی تعلیمات کا پرتو گہرا رہا۔ عرب کا جاہلی معاشرہ بھی جس کے جہل و تاریکی کے متعلق مشہور ہے، لقمان جیسے حکیم کی تعلیمات کا وارث رہا یہ الگ بات ہے کہ زندگی میں ان کا چلن عام نہ تھا امرؤ القیس، لبید اور اعشیٰ وغیرہ شعرا کے کلام میں بھی لقمان کے افکار و تعلیمات کا تذکرہ موجود ہے۔

سیرت ابن ہشام اور اسد الغابہ کے مطابق سوید بن صامت جب مدینے سے حج کے لئے مکہ آئے اور حضور نبی کریم ﷺ کو حجاج میں تبلیغ کرتے ہوئے سنا تو کہا کہ جس نوع کی باتیں آپ بتاتے ہیں ان سے ملتے جلتے مضامین کا حامل ایک صحیفہءِ لقمان میرے ہاں بھی موجود ہے، حضور علیہ السلام کی فرمائش پر سوید نے اس

صحیفے کا ایک حصہ آپؐ کو سنایا، آپؐ نے اس کی تعریف کی اور فرمایا بہت اچھا کلام ہے مگر ہمارے پاس اس سے بھی بہتر کلام ہے چنانچہ آپؐ نے قرآن مجید سنایا [۱۹]

لقمان کی دانش مندی وفضیلت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ خود قرآن حکیم میں ان کے اقوال کو نقل کیا گیا اور ان کے نام سے قرآن حکیم کا ۳۱ واں سورہ منسوب کیا گیا۔ لقمان کی تعلیمات میں حکمت ودانائی کی فضیلت معرفت الٰہیہ، مذمّتِ شرک، اَخلاقِ فاضلہ اور اوصافِ حمیدہ کی جانب متوجہ کیا گیا ہے۔

یہی وہ تعلیمات ہیں اسلام جن کا پیام بر بن کر آیا اور حضرت لقمان کے زمانہ کے بعد حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت تاریخ اَخلاقیات میں ایک انقلاب آفریں موڑ ثابت ہوئی۔

اسلام کی بنیادی خصوصیت توازن ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اپنے ارشاد کے مطابق اس کی تخلیق نہایت معقول اور متوازن ہے اور اس میں کسی نوع کا تفاوت نہیں پایا جاتا، قرآن حکیم اپنے قاری کو بہ تکرار یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کارخانہءِ عالم پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ اسے اس میں کہیں کوئی خلل دکھائی دیتا ہے اور پھر خود ہی خلل تلاش کرنے والے کی ناکامی بھی ظاہر کرتا ہے:

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ؕ

(تو اے دیکھنے والے) اللہ رحمٰن کی پیدائش میں کوئی تفاوت نہ دیکھے گا دوبارہ (نظریں ڈال کر) دیکھ لے کیا کوئی شگاف بھی نظر آ رہا ہے؟ پھر دوہرا کر دوبارہ

دیکھ لے تیری نگاہ تیری طرف ذلیل (وعاجز) ہوکر تھکی ہوئی لوٹ آئے گی۔ [۲۰]

دراصل یہی عدل ہے جو اس کائنات کے ذرّے ذرّے میں جاری وساری ہے اور ایسے ہی عدل کی توقع خالق اپنی تخلیق سے کرتا ہے۔سورۃ النحل میں صراحت کردی گئی ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، بھلائی کا اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرنے کا اور روکتا ہے بے حیائی کے کاموں سے، ناشائستہ حرکتوں اور ظلم وزیادتی سے وہ خود تمھیں نصیحتیں کررہا ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو [۲۱]

اللہ تعالیٰ خود عادل ہے وہ حق بات کہتا ہے وَاللّٰهُ يَقُولُ الْحَقَّ [۲۲] اور حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے وَاللّٰهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ [۲۳] اور وہ توازن کو قائم رکھتا ہے قَآئِمًا بِالْقِسْطِ [۲۴] اس لئے وہ اپنے بندوں کو بھی عدل کا حکم دیتا ہے، روزمرہ زندگی کے امور و معاملات، مہمات امور میں دینی و دنیاوی تمام پہلوؤں میں عدل کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے۔

عدل کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں اپنے موافق صورت حال ہو وہاں عدل کر لیا جائے اور مخالف افراد یا صورتحال میں عدل کی بجائے کسی اور جادے پر گام زن ہو لیا جائے بلکہ اللہ کہتا ہے کہ عدل قائم رکھو خواہ مقابلے میں عزیز قرابت دار ہو۔ [۲۵] خواہ عداوت فریق مخالف سے ہو خواہ مخالفت دینی ہو [۲۶]

امیر یا غریب، بلند مرتبہ یا کم مرتبہ، جنگ یا امن ہر صورت اور ہر پہلو میں عدل درکار ہے عدل کا جادہ اتنا اہم اور ضروری ہے کہ اگر اس پر چلنے میں اندیشہء زیاں ہو تو بھی اسی پر چلا جائے۔

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى اَنْ تَعْدِلُوا (تم عدل کرنے میں اپنے نفس کی پیروی نہ کرو) ۲۷ اور کوئی عدل ایسا نہیں جس کا نتیجہ نقصان کا باعث ہو، اس لئے کہ عدل وقسط اللہ کے پسندیدہ رویے ہونے کے باعث سراسر خیر اور فلاح ہیں۔

فَاَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۲۸ آیہ مبارکہ (اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ ...... الخ) میں جملہ اوامر و منہیات آ گئی ہیں اس لئے علما نے اسے تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (ہر شے کی صاف وضاحت) ۲۹ کا مظہر کہا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک خیر و شر کے بیان کو اس آیت میں اکٹھا کر دیا ہے، گویا کوئی عقیدہ، خلق، نیت، عمل، معاملہ اچھا یا برا ایسا نہیں جو امر اونہیا اس کے تحت میں داخل نہ ہو گیا ہو بعض علما نے لکھا ہے کہ اگر قرآن میں کوئی دوسری آیت نہ ہوتی تو تنہا یہی آیت تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کا ثبوت دینے کے لئے کافی تھی۔ ۳۰

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول بہ کثرت نقل ہوا ہے، قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول، امام بخاری نے، ابن ابی حاتم نے، حاکم نے اور بیہقی (شعب الایمان) نے بھی نقل کیا ہے حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور یہ کہ یہی آیت حضرت عثمان بن مظعونؓ کے قبول اسلام کا باعث ہوئی۔ ۳۱

اس آیت میں تین باتوں کا حکم دیا گیا اور تین سے منع کیا گیا ہے: پہلی بات جس کا حکم دیا گیا ہے عدل ہے عدل کو بعض نے انصاف کے معنوں میں لے لیا ہے لیکن انصاف نصف سے ہے اور اس کا معنی برابری ہے عدل بسا اوقات برابری کو مستلزم نہیں ہوتا ۔ یہ کائنات عدل کی بناء پر استوار ہے۔ یعنی توازن و اعتدال

جب مظہر (وجود یا شے) میں تناسب ہو تو اسے حسین کہا جاتا ہے، محرومِ تناسب مظہر، حسن سے محروم ہوتا ہے اس لئے توازن عدل ہے اور عدل حسن۔ گویا یہ کارخانہ حسین ہے اور اپنے صانع کے جمال پر دلالت کرتا ہے ۳۲ یہی عدل اصلِ اخلاق ہے۔

لغویّین نے عدل کو جور کی ضد بتایا ہے اور طبیعت میں کسی چیز کے مستقیم ہونے کے خیال، جماؤ یا رسوخ کو بھی عدل کہا گیا ہے۔ یہی تعریف اخلاق کی بھی ہے جو آپ سطورِ گزشتہ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

یوں گویا یہ قول کہ عدل سے مراد استقامت علی الحق ہے بجا ٹھہرتا ہے اور حضرت ابن عباسؓ کا یہ کہنا بھی کہ عدل سے مراد توحید ہے بالکل برحق ہے اگرچہ اس کے مطالب کا حصر بہت سہل نہیں۔

عدل کے حکم سے مراد حقوق کی بے لاگ ادائیگی اور جملہ امور و معاملات میں توازن و اعتدال سے کام لینا ہے عقیدہ، معاملات جذبات، احساسات اور اخلاقیات سب کے سب ازروئے توازن درست ہوں ان کی چولیں ٹھیک بیٹھیں۔ اپنی ذات کے معیار پر دوسرے کی پسند ناپسند کو قیاس کیا جائے افراط وتفریط سے بچا

جائے یہ نہ ہو کہ اپنوں کے لئے عدل و انصاف کا مطالبہ ہو اور اغیار کے لئے ظلم و زیادتی کو روا رکھا جائے، قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر اس نہایت اہم نفسیاتی نکتے کی طرف یوں توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی

ہرگز ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی تمھیں جادۂ عدل سے ہٹا دے، عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے [۴۳]

گویا عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی عدل کی راہ میں رکاوٹ نہ بن پائے یہی تقویٰ کا مطالبہ ہے...... اس آیت میں تقویٰ کو جس طرح عدل کے قرب سے مشروط کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "دوست و دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملہ میں جذباتِ محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا، حصولِ تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے"۔ [۴۴] اور اس کا حصول سوائے خشیت الٰہیہ کے ممکن نہیں ہے جیسا کہ اسی آیت میں معاً بعد وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (اور ڈرتے رہو اللہ سے اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو) [۴۵] کے ارشادِ ربانی سے صراحت ہو جاتی ہے۔

دوسری چیز جسے اسلامی معاشرے کی اساس قرار دیا گیا ہے احسان ہے یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی معاشرے میں قانون اور ضابطے کی عملداری ہو، اس کی چولیں ٹھیک بیٹھی ہوں لوگ ایک دوسرے کا حق ادا کرتے ہوں کوئی کسی پر زیادتی نہ کرتا ہو لیکن اس کے باوجود ایسا معاشرہ خوب صورت اور دل کش انسانی زندگی کی تصویر بھی

پیش کرے.........ضروری نہیں۔

انسانی زندگی کا حسن محض قوانین کے اطلاق میں پوشیدہ نہیں بلکہ زندگی کا حسن انسانی کمزوریوں اور ضرورتوں کا لحاظ رکھنے، عفوودرگزر سے کام لینے؛ چشم پوشی کرنے، الفاظ کے اچھے معنی تلاش کرنے اور دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینے میں پوشیدہ ہوتا ہے......... یہ بات بھی ایمان باللہ کا ایک ثمر ہے گویا احسان کا رشتہ بھی توحید ہی سے ہے کہ جب اللہ پر ایمان کامل ہو اور آخرت کا شعور پیدا ہو جائے تو اسی سے حسنِ سلوک اور حسنِ عمل پیدا ہونے چاہیں۔ جیسا جیسا ایمان محکم ہوگا ویسا ہی حسنِ سلوک اور عفوودرگزر ظہور پائے گا۔ اس لئے بعض کے نزدیک احسان بھی توحید کا ہم معنی ہے.........حدیث جبرئیل میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک روز حضور علیہ السلام لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اس کے فرشتوں کا اور اس سے ملنے کا اور اس کے پیغمبروں کا یقین کرے اور مرکر جی اٹھنے کو مانے......پھر اس نے پوچھا اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، نماز ادا کرے اور زکوۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے.........پھر اس نے پوچھا:

مَا الْاِحْسَانُ ؟ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَراہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَراہُ فَاِنَّہٗ یَراکَ

احسان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ اللہ کی ایسے عبادت کی جائے کہ جیسا تو اِس کو دیکھ رہا ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو اتنا خیال رکھا جائے کہ وہ تجھے دیکھ

رہا ہے۔ ۳۶ ؎

یہ شعور کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اعمال و افعال کو احتیاط کے جس حُسن سے مزیّن کرسکتا ہے اس کی اندازہ گیری دشوار نہیں ...... پھر اس کا دوسرا درجہ کہ اگر تقویٰ کا یہ مقام حاصل نہ ہوسکے تو پھر جیسے وہ تمھیں دیکھ رہا ہے، بھی کم موثر نہیں، گویا احسان، احتیاط اور مواظبت کا مظہر ہے۔ محض برابری کا نہیں

انسانی زندگی کی دو سطحیں ہیں ایک وہ ابتدائی سطح جس پر ہوتے ہوئے انسان دنیا پر اوّلین نگاہ ڈالتا ہے، دوسری وہ سطح جو تعلیم، تہذیب اور تمدّن کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے لیکن بعض اوقات تعلیم تہذیب اور تمدن انسان کو اتنا ضابطہ پسند بنا دیتے ہیں کہ وہ اس ابتدائی انسانی سطح کو فراموش کر دیتا ہے جہاں سے خود اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور دوسروں سے اس کے مطالبات ایسی شدت اختیار کر لیتے ہیں جس میں انسانی کمزوریوں کا کوئی لحاظ نہیں رہ جاتا۔

اور وہ آدمی کو انسان کا درجہ میسر نہ ہونے پر کفِ افسوس ملتا رہتا ہے لیکن احسان کا درجہ یہ ہے کہ ع

ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

عدل معاشرے کا اصل اصول ہے اور احسان اس کا جمال اور یہ جمال اس وقت ہی حاصل ہوتا ہے جب انسان کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ خوب صورت ہوجائے درگزر، برداشت، معافی، صلہ رحمی، دوسرے کو اس کے مقام سے زیادہ دے

دینا احسان ہی کے مظاہر ہیں گویا معاشرے کی اساس محض قانون وانصاف پر نہیں تزکیہ وتہذیب پر ہے جو معاشرے اپنے اندر تزکیہ وتہذیب پیدا کر لیتے ہیں ان کے افراد کا باہمی تعلق ان کھردرے معاشروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور خوش گوار ہوسکتا ہے جن میں ہر شخص ہر وقت ترازو لیے بیٹھا ہوتا ہے۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ عدل سے فرض مراد ہے احسان سے نفل، جس طرح فرائض کی کوتاہی نوافل سے پوری ہوجاتی ہے اسی طرح عدل میں رہ جانے والی کمی کا ازالہ احسان سے کیا جاسکتا ہے، دراصل اسلام کا ظہور تاریخ کے اس دور میں ہوا جب اس سے پہلے قانون اور اَخلاق الگ الگ اپنی بہار دکھا چکے تھے اور یہ معلوم ہو چکا تھا کہ قانونِ محض تبدیلی کی ضمانت فراہم کرتا ہے نہ اَخلاقِ محض...... اگر قانون کی عمل داری اور قانون پر شدّت سے کار بند رہنا ہی سب کچھ ہوتا تو پھر تورات کے احکام کافی تھے، زمانے کو ان سے آگے بڑھنے کی ضرورت پیش نہ آتی جس میں؛

''اور تجھ کو زرا ترس نہ آئے اور جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، دانت کا بدلہ دانت، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں ہو کی تلقین کردی گئی تھی'' ۳۷

تورات کے دس احکام (Ten Commandments) میں تحدید وتعین کی شان جلوہ گر تھی اور قوانین کا انداز یوں تھا:

''اور جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں ان کی اولاد کو تیسری اور چوتھی پشت تک باپ دادا کی بدکاری کی سزا دیتا ہوں ۳۸

یہ موسوی شریعت تھی جس میں قانون کو اس کی تمام تر قوت کے ساتھ نافذ کیا گیا تھا شاید اس کا سبب قوم یہود کی وہ سختی تھی جس سے ان کے قلوب دوچار ہو گئے تھے اس میں رحمت، رافت معافی اور درگزر کا کوئی گزر نہیں تھا...... پھر جب زمانے نے کچھ اور کروٹ بدلی، اسے ایک نئے مسیحا کی ضرورت پیش آئی تو قانونِ محض کی فصیل میں دراڑ آ گئی اور دنیا نے عیسوی شریعت کی شکل میں رحمت و رافت اور درگزر و معافی کے رنگوں کی جلوہ گری دیکھی چنانچہ انجیل مقدس میں کہا گیا:

''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دُوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا'' [۲۹]

''تم سن چکے ہو کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا کرو تا کہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو'' [۳۰]

تورات میں اگر ضابطہ پسندی اپنی انتہائی صورت میں ظاہر ہوئی تھی تو انجیل نے عفو و درگزر کے رویے کو اس کی اِنتہا تک پہنچا دیا لیکن صدیوں کی مسافت طے کرنے پر دنیا نے تجربہ کر لیا کہ یہ دوسرا رویّہ بھی پہلے رویے کی طرح ناقابل عمل

ہے......ایک گال پر طمانچہ کھانے کے بعد دوسرا گال سامنے کر دینا ممکن نہیں اور انسانی فطرت کے اقتضا سے بھی بعید ہے، اسباب کے اعتبار سے بھی اور نتائج کے اعتبار سے بھی اگر ایسا ممکن ہوتا تو آج عیسوی شریعت کی پاسبان عالمی طاقت کے زیرِ اثر دنیا کی صورتِ حال موجودہ حالت سے مختلف ہوتی۔

پس معلوم ہوا کہ انسانی زندگی اور معاشرے کی تربیت اور تعلیم کے لئے محض قانون کافی ہے نہ محض اَخلاق بلکہ دونوں کے ایک ایسے آمیزے کی ضرورت ہے جس میں حسب ضرورت کبھی قانون کا پلڑا بھاری ہو اور کبھی اَخلاق کا اور احسان ان دونوں پر مستزاد کیفیت کا نام ہے۔

اقربا اعزّہ اور غربا کے لئے صلہ رحمی کی تلقین دراصل احسان ہی کی تلقین ہے۔محولہ بالا آیات اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ ......میں تیسری شے یہی صلہ رحمی ہے جسے اِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ایک ایسا انسان جو اپنے ذاتی اعمال وافعال میں عدل وقسط اور احسان کے راستے پر گام زن ہوگا۔اپنے معاشرتی تعامل (Social Interaction) میں بھی اس عدل کو بروئے کار لائے گا، وہ اپنے اوپر اللہ کے انعامات میں دوسروں کو بھی شریک کرے گا اور اس کے ساتھ شخصِ غیر کی یہ شراکت احسان کا مظہر بن کر ابھرے گی۔

اپنی کمائی اور محنت کے ثمر میں دوسروں کو حق دینا ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہے اور دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنا معاشرتی زندگی میں حسن پیدا کرنے کی پہلی منزل ہے۔پھر جب ان کے وجود کو تسلیم کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس سے بڑھ کر ان

میں سے ضرورت مندوں کی ذمہ داری بھی قبول کی جائے تو معاشرہ کیسی وحدت اور یگانگت کا منظر پیش کر سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔

پہلے عدل کا ذکر کیا گویا عدل سب کے لئے ضروری ہے، احسان جو جس قدر کر سکے اس کے حق میں ہے اور اس کا صلہ اسے احسان ہی کی صورت میں ملے گا هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ [۴۱] لیکن اس میں بھی وہ لوگ جن کا فرد سے قریبی تعلق ہے ان کا حق دور والوں سے بڑھ کر ہے اِن سے ان کے مرتبے کے مطابق سلوک کیا جائے قرابت کا تعلق بہت اہم ہے، حضور علیہ السلام نے قریش کی مخالفتوں کے جواب میں بھی اسی کا حوالہ دیا تھا۔

قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی [۴۲]

میں تم سے کسی اور شے کا اجر طلب نہیں کرتا مگر وہ مودت جو قرابت کے باعث ضروری ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرابت داروں کا حق اتنا اہم ہے کہ اسے غیر اہل ایمان سے بھی طلب کیا جا سکتا ہے، قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر حق قرابت کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔

وہ حسنِ سلوک جو ذی القربیٰ کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے عمومی اعتبار سے سارے معاشرے کے ساتھ مطلوب ہے، حسنِ سلوک کی صورتیں متعدد ہیں معاشرتی و تمدنی بھی اور مالی بھی، مالی اعتبار سے بھی اہل ایمان کو بتایا گیا ہے کہ وہ انفاق، اطعام، صدقہ اور زکوٰۃ کے ذریعے سے معاشرے میں معاشی عدم توازن کی خلیج

کو پاٹنے کی کوشش کریں۔ان کا یہ حسنِ سلوک اللہ کی رضا اور ان کے لئے آخرت کے انعامات کی فراہمی کا سبب بنے گا۔اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کئے جانے والے مال کو دوسروں کی فلاح پر خرچ کر دینا یا دوسروں کی ضروریات کے لئے وقف کر دینا ایک خاص اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہ تھا اور قرآن کی تعلیمات کا یہ کرشمہ ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں کے معاشی تصور کو بالکل تبدیل کر دیا اور ان کے زاویہء نظر میں اتنی وسعت پیدا کر دی کہ وہ نفع نقصان کے ظاہری دوائر سے بہت بلند ہو کر سوچ سکیں ان کے قلوب میں کشادہ اور ان کی سرگرمیوں کا محور رضائے الٰہی ہو نہ کہ دنیوی منافع اِن کا مطلوبِ محض قرار پائیں ، مادہ پرستانہ اذہان اس تصور کو پا ہی نہیں سکتے جو قرآن نے متعارف کروایا۔انفاق فی سبیل اللہ کا انوکھا اصول۔اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دیتا ہے جس سے بظاہر فرد کا دنیوی فائدہ نہیں لیکن قرآن اس انفاق کو ایک قرض قرار دیتا ہے ایسا قرض جس کی واپسی بہت نفعے کے ساتھ ہو گی۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيْرَةً ط وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ

تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کر دے گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اور اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔ ۴۳

اس سے آگے بڑھ کر قرآن ایک نہایت خوب صورت مثال سے اس صلہ رحمی کا صلہ واضح کرتا ہے

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

کیا خوب صورت تشبیہ ہے: گندم کا ایک دانہ اس سے نکلنے والا پودا اس پودے میں سات خوشے گیہوں کے اور ہر خوشہء گیہوں میں سو دانے گویا ایک دانے کا نتیجہ سات سو دانے .... ایک حسنِ سلوک سات سو مرتبہ بڑھا کر لوٹایا جائے گا۔ ؎ لیکن اس اضعاف مضاعفہ کی کچھ شرائط بھی ہیں مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بعض لطیف نکات بیان فرمائے ہیں مثلاً یہ کہ ایک دانہ گندم سے سات سو دانے حاصل کرنے کے لئے شرط ہے کہ دانہ عمدہ ہو، خراب نہ ہو، اسے کاشت کرنے والا کاشتکاری کے فن سے خوب واقف ہو اور جس زمین میں اسے بویا جائے وہ عمدہ اور زرخیز ہو۔ چنانچہ اللہ کی راہ میں خرچ کے لئے بھی ضروری ہے کہ مال پاک ہو ناپاک یا ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جانے والا مال نہ ہو (یعنی دانہ) نیت بخیر اور طریقہ وہ جو حضور علیہ السلام سے ثابت ہو اور جہاں خرچ کیا جائے وہ جگہ مستحق ہو یعنی زمین زرخیز ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انفاق کے مزید آداب یہ بتائے ہیں کہ صلہ رحمی کرنے والا، جس پر مہربانی کرے (جو دراصل اس کا حق ہے) اس پر احسان نہ جتلائے اور اسے ایذا نہ پہنچائے ۔۔۔ چونکہ اللہ خود فراخ دست ہے جتنا چاہے دے سکتا ہے اس لئے اپنے بندوں سے بھی اس کی یہی توقع ہے کہ وہ فراخ حوصلگی سے کام لے کر اس کی راہ میں خرچ کریں۔

ایک دانہ گندم کے بدلے سات سو دانوں کا ثواب معمولی اجر نہیں ہے، یہ بات سمجھانے کا ایک طریقہ ہے لیکن اس میں تحدید کا ایک پہلو بہ ہر حال موجود ہے خواہ وہ سات سو گنا ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ ابن مردویہ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضورؐ نے اس میں افزونی کی دعا کی چنانچہ اس کے بعد ''مَن ذَالَّذِی یُقرِضُ اللّٰہَ .... الخ'' [۴۵] والی آیت کا نزول ہوا جس میں کئی گنا اضافے کی بشارت دی گئی .... حضور علیہ السلام نے اپنی دعا پھر دوہرائی چنانچہ ''اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُونَ اَجرَھُم بِغَیرِ حِسَابٍ'' [۴۶] کی آیت نازل ہوئی۔

جس میں بغیر کسی تحدید کے اجر دینے کا وعدہ کیا گیا اب معلوم ہوا کہ اجر و ثواب کی کوئی آخری حد نہیں عمل کرنے والے کے ہاں اخلاص جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر ثواب میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ [۴۷]

بدنی آزمائش (جسمانی عبادات) اور مالی آزمائش (زکوۃ و انفاق و اطعام وغیرہ) ہر دو کا مقصود دراصل طبائع کو ہر طرح کے حالات میں اللہ کے حکم کے مطابق ڈھالنے کی تربیت دینا ہے اور روحانی اور اخلاقی قوت کے سرچشمے کی طرف رخ پھیر دینا ہے۔ [۴۸]

''صلہ رحم ایک مستقل نیکی ہے جو اقارب و ذوی الارحام کے لئے درجہ بدرجہ استعمال ہونی چاہیئے گویا ''احسان'' کے بعد ذوی القربیٰ کا بالتخصیص ذکر کے متنبہ فرما دیا کہ عدل و انصاف تو سب کے لئے یکساں ہے لیکن مروّت و احسان کے وقت بعض مواقع بعض سے زیادہ رعایت و اہتمام کے قابل ہیں فرق مراتب کو

فراموش کرنا ایک طرح قدرت کے قائم کئے ہوئے قوانین کو بھلا دینا ہے۔ ۴۹؎

"اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ .... الخ" والی آیت مبارکہ میں جس طرح تین امور کا حکم پایا گیا ہے اسی طرح تین امور سے ممانعت بھی کی گئی ہے اور وہ تین فحشا منکر اور بغی ہیں۔

فحشا سے بے حیائی مراد ہے اور اس کی ناپسندیدگی قرآن حکیم میں بار بار ظاہر کی گئی ہے الاعراف میں یہ مضمون بدین الفاظ وارد ہوا ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

تو کہہ دے میرے رب نے حرام کیا ہے صرف بے حیائی کی باتوں کو جوان میں کھلی ہوئی ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو اور اس بات کو کہ شریک کرو اللہ کا ایسی چیز کو کہ جس کی اس نے سند نہیں اتاری اور اس بات کو کہ لگاؤ اللہ کے ذمے وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں۔ ۵۰؎

فحشا، فاحشۃ، فحش کے معنی حدود سے تجاوز کرنے کے ہیں، انسان جب اخلاقیات کی ان حدود سے تجاوز کرتا ہے جو خالق کائنات نے مقرر فرمادی ہیں تو وہ فحش یا فحشا کا مرتکب ہوتا ہے اور اس سے اللہ نے ممانعت کی ہے۔ قرآن نے زنا کے لئے فاحشۃ کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسے بری راہ (ساءَ سبیلا) ۵۱؎ قرار دیا ہے کہ حدود سے تجاوز نامحمود و مذموم اور ناپسندیدہ ہے اس لئے قبیح ہے یوں فحشا کے معنی میں قباحت داخل ہے۔

دوسری ممانعت منکر کی ہے، منکر معروف کی ضد ہے اور اس کے معنی اجنبی کے ہیں قرآن حکیم نے ایک سے زائد مقامات پر یہ لفظ اجنبیت کے معانی میں استعمال کیا ہے مثال کے طور پر حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے نوجوان لڑکوں کے روپ میں آئے تو آپؑ نے فرمایا اِنَّکُمْ قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ تم لوگ تو کچھ انجان معلوم ہوتے ہو۔ ۵۲ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کے بیان میں قرآن حکیم نے فرمایا ہے:

اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ

وہ جب ان کے ہاں آئے تو سلام کیا ابراہیم نے جواب دیا (اور کہا یہ تو اجنبی لوگ ہیں ۵۳

چنانچہ اس سیاق کلام میں منکر سے ایسا فعل مراد ہوا جو ایک نارمل زندگی کے افعال میں اجنبی ہو اور عرفِ عام میں ناپسندیدہ۔ اور فطرت انسانی اس سے اِبا کرتی ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ ایسے کاموں سے منع کرتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کے ماننے والوں کے اخلاق میں ایسا کوئی فعل دخیل نہیں ہوتا جس سے انسانی طبائع نفور ہوں اور جو معاشرے کی عمومی صورت حال کو ناخوش گوار بنائے اور جس سے اللہ کی ناراضگی لازم آئے۔

تیسری ممانعت بغی کی ہے قرآنی سیاق وسباق میں یہ اصطلاح حدود سے تجاوز کر کے کسی دوسرے پر دستِ ستم دراز کرنے کے معنوں میں آتی ہے، سورہ الاعراف کی آیت ۳۳ جو ما قبل میں نقل کی جا چکی ہے (دیکھئے حوالہ نمبر ۵۰) اس میں

اَلبَغی بِغَیرِ الحَقِّ کے الفاظ آئے ہیں جن کا معنی "ناحق کی زیادتی" ہے سورۃ شوریٰ میں بھی یہ لفظ آیا اور زیادتی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ

اور وہ لوگ کے جب ان پر ہووے چڑھائی تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ [۵۴]

اب معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک حدود سے تجاوز، خلافِ معروف طبائع میں اِبا پیدا کرنے والے اعمال اور زیادتیاں ناپسندیدہ اور مذموم ہیں اور قرآن ان سے احتراز کی تلقین کرتا ہے۔

اس آیت کی جامعیت کا یہ پہلو نہایت قابل توجہ ہے کہ جس طرح اس کے پہلے حصے میں تین ایسے امور کا حکم دیا گیا کہ کوئی نیکی اور خیر جن کے دائرے سے باہر نہیں اس طرح تین ایسے امور سے منع کیا گیا کہ ہر خرابی اور شر جن کے ذیل میں آجاتے ہیں، مولانا سلیمان ندوی نے ان تین اخلاقِ ذمیمہ کو منطق کی اصطلاح میں "مانعۃ الخلو" قرار دیا ہے یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہوسکتا ہے مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے [۵۵] اور یہ تینوں برائیاں شخصی، تمدنی اور قومی و بین الاقوامی زندگی کے لئے تدریجاً نقصان دہ اور اس کے سکون کو غارت کردینے والی ہیں، جس کا نتیجہ اللہ کی رحمت سے دوری اور اس کے غضب کو دعوت دینے کی صورت میں نکلتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی اصل قرآن حکیم ہے اور قرآن ہدایت و تزکیے کی کتاب

ہے جو تخلیق وجود کے چوتھے مرتبے پر انسانوں کو دی گئی ہے۔۔۔ مراتب وجود چار ہیں جیسا کہ خود قرآن حکیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے:

"اَلَّذِی خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِی قَدَّرَ فَهَدٰی" [52]

یعنی تخلیق، تسویہ، تقدیر اور ہدایت۔۔۔ پہلے انسان کو خلق کیا گیا پھر اس کے اعضاو جوارح ہیئت و کیفیات میں توازن و تسویہ پیدا کیا گیا پھر اس کے لئے اچھی یا بری تقدیر مقرر کی گئی اور پھر اسے ہدایت کی راہ بجھا دی گئی۔۔۔ ہدایت کی راہ جو وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (اور ہم نے اسے دو راستے دکھا دیے) [53] کی روشنی میں ہر فرد بشر پر واضح کر دی گئی ہے کامل و اکمل ہے کسی بھی نقص و ناتمامی سے پاک قرآن کا موضوع بننے والی ہدایت کا تعلق اخروی فوز و فلاح سے ہے دنیوی زندگی کو اس نے متاع غرور اور آزمائش قرار دیا ہے اس سفر کی منزلیں طے کرنے کے لئے اپنے ماننے والوں کو سچائی، راستی، دیانت، شکر گزاری، خشیت، انصاف، انکسار، معافی، نرمی، رافت، رحمت، خدمت خلق اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کی ہے لیکن درحقیقت قرآن کا اصل موضوع عقیدے کی درستی ہے.......... اور اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے اس کے ساتھ رسالت و آخرت جن کا حصر اسلام کی اساسی تعلیمات میں کر دیا گیا ہے.......... اس سارے تفصیل مطالعے کی روشنی میں جو گزشتہ سطور میں پیش کیا گیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں پر اخلاقیات کا کوئی بنا بنایا نظام نافذ نہیں کرتا...... وہ اگر عدل، احسان، صلہ رحمی کی ہدایت کرتا ہے اور فحشا منکرات اور حدود سے تجاوز کرنے سے روکتا ہے تو اس کا سبب دنیوی منافع و محاسن

نہیں ہیں۔ سورہ نور میں اور بعض دوسرے مقامات پر جن اخلاقی ضوابط کی نشاندہی کی گئی ہے وہ بھی دنیوی فلاح کے نقطہء نظر سے نہیں ہے بلکہ عدل احسان صلہ رحمی...... آخرت کے تصور کے ساتھ مربوط ہیں اور مدعا انسان کے ظاہر و باطن کی یکسانی ہے...... یہ قول کتنا حکمت آمیز ہے کہ اگر ظاہر اور باطن برابر ہوں تو یہ کیفیت عدل ہے اگر باطن ظاہر سے اچھا ہو تو یہ کیفیت احسان ہے اور اگر ظاہر باطن سے اچھا ہو تو یہ فحشا و منکر ہے۔ پس ساری بحث کا خلاصہ انسان کے ظاہر و باطن کا تسویہ کہلا سکتا ہے اور ظاہر و باطن کا تسویہ کس لیے......؟ رضائے الٰہی کے لئے اور رضائے الٰہی کی طلب نتیجہ ہے عقیدے کا اور عقیدوں کا عقیدہ توحید ہے۔

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کسی لگے بندھے نظام اخلاق کو پیش نہیں کرتا بلکہ اس کی بنیادی تعلیم توحید پر مبنی ہے، اللہ کے سوا کسی اور کو معبود بنانا ظلم عظیم ہے، یہ دنیا اور اس دنیا کی زندگی بے مقصد نہیں ہے [۵۸]

متاع دنیا قلیل ہے اور آخرت، اہل تقویٰ کے لئے بہتر ہے جہاں عمل کرنے والوں کو ان کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کا اجر ملے گا اور ایک تاگے کے برابر بھی ان کا حق نہیں رکھا جائے گا [۵۹] اس لئے یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے [۶۰] ...... جو شخص عقیدہء توحید کو قبول کرے گا اس کے پیش نظر آخرت اور روزِ حشر کا حساب ہوگا، آخرت کی میزان کا تصور اسے ظلم و زیادتی سے باز رکھے گا اور رفتہ رفتہ اس کے اخلاق و کردار میں نیکی، نرمی، رافت، برداشت، عدل انصاف احسان کی محبت گھر کر جائے گی اور وہ فواحش منکرات اور حدود سے تجاوز کرنے کے رویّوں کو ناپسند کرنے لگے گا...... جب یہ

پسند و ناپسند طبیعت میں راسخ ہو جائے گی تو اسے نیکی اور حسن خلق کا ملکہ حاصل ہو جائے گا۔۔۔ اور یہی ملکہ رفتہ رفتہ اس کے ہاں حسن کردار کے بے تکلف ظہور کا سبب بن جائے گا، پھر اسے معاشرتی زندگی میں خوبیء کردار کو اپنانے کے لئے کسی خارجی منفعت ومضرت پر نظر رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔۔۔ وہ اپنے اعمال کا تعیّن وقتی حالات وواقعات کی روشنی میں نہیں کرے گا...... دیانت روی عدل وقسط اور احسان اس کی پالیسی نہیں ہوں گے بلکہ ان سب کا صدور اس کی طبیعت کا اقتضا بن کر ہونے لگے گا اور اس کا عمل اخلاقِ فاضلہ کا ایک حسین نمونہ بن جائے گا۔

حوالے اور حواشی:

1- Aristotle *The Philosophy of Aristotle* Selection and Introduction by Renford Bambrough Translated by: A.E. Wardman and J.L.Creed.

London: A Mentro Classic 1963 P.303

۲۔ ارسطو: علم الاخلاق بحوالہ أخلاق اورفلسفہ أخلاق از محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی
دہلی: ندوۃ المصنفین ۱۹۵۰ء

3- Santas, Gerasimos Xenophon, *Socrates Philosophy in Plato's early Dialogues (The Arguments of the Philosophers.)*

Edited by: Ted Honderich

London: Rontledge & Kegan Paul 1979, P.196

۴۔ افلاطون مکالمات افلاطون مترجمہ محمد رفیق چوہان
اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۷ء ص ۱۱۵

5- *Santas, Gerasimos Xenophou P.184*

6- *op-cit*

۷۔ ایس این داس گپتا تاریخ ہندی فلسفہ جلد اول مترجم رائے موہن لعل ماتھر
دہلی: ترقی اُردو بیورو اپریل ۱۹۸۳ء ص ۲۲۲

۸۔ برمان نئے تولو کا انکار ص ۲۶ بحوالہ بالا ص ۲۲۲۔۲۲۳

۹۔ ابوداؤد السجستانی، امام سلیمان بن الاشعث السنن کتاب الفرائض

بحوالہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱۱

۱۰۔ پارہ نمبر ۲۱ سورہ نمبر ۳۰ الروم آیت نمبر ۳۰
اس کے بعد قرآنی آیات کے جتنے حوالے آئیں گے اسی ترتیب سے درج ہوں گے، البتہ اختصار کی غرض سے پارہ کے لئے پ کی علامت درج کی جائے گی سورہ نمبر کے الفاظ حذف کر کے نمبر کے ساتھ سورہ کا نام درج ہوگا۔

۱۱۔ بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل صحیح بخاری شریف مترجم علامہ وحید الزمان
لاہور: مکتبہ رحمانیہ ۱۹۸۵ء ج ۲ ص ۹۶۳ تفسیر سورہ روم

۱۲،۱۳۔ غزالی ابوحامد مذاق العارفین اُردو ترجمہ احیاء علوم الدین از محمد احسن صدیقی نانوتوی
لاہور ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز س۔ن
نیز غزالی کا تصوّر اَخلاق اُردو ترجمہ الأخلاق عندالغزالی ص ۱۸۹

۱۴۔ مذاق العارفین ص ۶۹

۱۵۔ پ ۲۹ ۷۱ نوح ۳

۱۶۔ پ ۲۹ ۷۱۔نوح ۱۵

۱۷۔ پ ۲۵ ۴۳۔الزخرف ۶۴

۱۸۔ پ ۲۷ ۵۷۔الحدید ۲۷

۱۹۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور دانش گاہ پنجاب ۱۹۸۵ء ج ۱۸ ص ۱۲۸

۲۰۔ پ ۲۹ ۶۷۔الملک ۴،۳

۲۱۔ پ ۱۴ ۱۶۔النحل ۹۰

۲۲۔ پ ۲۱ ۳۳۔الاحزاب ۴

۲۳۔ پ ۲۴ ۴۰۔المومن ۲۰

۲۴۔ پ ۳ ۳۔آل عمران ۱۸

۲۵۔ پ ۷ ۶۔الانعام ۱۹

۲۶۔ پ ۲۵ ۴۲۔الشوریٰ ۲

۲۷۔ پ ۵ ۴۔النسا ۱۳۵

۲۸۔ پ ۲۶ ۴۹۔الحجرات ۹

۲۹۔ پ ۱۴ ۱۶۔النحل ۸۹

۳۰۔ شبیر احمد عثمانی مولانا حواشی بر ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن
مکہ مکرمہ : مجمع خادم الحرمین الشریفین الملک فھد لبطاعة
المصحف الشریف س۔ن ص ۳۶۶
(اس تحریر میں قرآنی اقتباسات کے تراجم کے لئے بالعموم یہی ترجمہ پیشِ نظر رہا ہے)

۳۱۔ ثناء اللہ پانی پتی، قاضی مولانا تفسیر مظہری مترجمہ سید عبدالدائم الجلالی
کراچی: دارالاشاعت ۱۹۹۹ء ج ۶ ص ۲۸۲

۳۲۔ اللّٰہ جمیل و یُحِبُّ الجمال

۳۳۔ پ ۶ ۵ المائدہ ۸

۳۴۔ شبیر احمد عثمانی مولانا بحوالہ ص ۱۴۴

۳۵۔ پ ۱۴ ۱۶ النحل ۹۰

۳۶۔ بخاری امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل صحیح بخاری شریف مترجمہ علامہ وحید الزماں
محولہ بالا ج اول ص ۱۲۷، ۱۲۸

۳۷۔ استثنا باب ۱۹ آیت ۲۱

۳۸۔ خروج ۲۰ ۲

۳۹۔ متی ۵ ۳۸۔۴۱

۴۰۔ متی ۵ ۴۳۔۵۲

۴۱۔ پ۲۷ ۵۵ الرحمن ۶۱

۴۲۔ پ۲۵ ۴۲ الشوریٰ ۲۳

۴۳۔ پ۲ ۲ البقرہ ۲۴۵
پ ۲۷ ۵۵۔الرحمن ۶۱
پ ۲۵ ۴۲۔الشوریٰ ۲۳

۴۴۔ پ ۲ ۲۔البقرہ ۲۴۵

۴۵۔ پ ۲ ۲۔البقرہ۲۶۱

۴۶۔ پ ۲۳ ۳۹۔الزمر۱۰

۴۷۔ تفسیر ابن کثیر ج اول ص۱۶

۴۸۔ جلال الدین محلی وجلال الدین السیوطیؒ تفسیر جلالین ج اول ص۱۱۹

۴۹۔ شبیر احمد عثمانی مولانا بحوالہ بالا ص ۳۶۷

۵۰۔ پ ۸ ۷۔الاعراف ۳۳

۵۱۔ پ ۱۵ ۱۷۔بنی اسرائیل۳۲

۵۲۔ پ ۱۴ ۱۵۔الحجر۶۲

۵۳۔ پ ۲۶ ۵۱۔الذاریات۲۵

۵۴۔ پ ۲۵ ۴۲۔الشوریٰ۳۹

یہاں سیاق کلام کی صراحت کے لئے اس سے اگلی آیت بھی ملاحظہ فرمائی جائے جس سے قرآن حکیم کا اصول عفو معلوم ہوتا ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ٥

اور برائی کا بدلہ ہے برائی ویسی ہی پھر جو کوئی معاف کرے اور صلح کرے سو اس کا ثواب ہے اللہ کے ذمے بے شک اس کو پسند نہیں آتے گنہگار۔(شوریٰ ۴۰)

۵۵۔ سلیمان ندوی، مولانا سید سیرۃ النبیؐ

اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۱ ج ۶ ص ۵۹۵

۵۶۔ پ ۳۰ ۸۷۔ الاعلیٰ ۱۔۳

۵۷۔ پ ۳۰ ۹۰۔البلد ۱۰

۵۸۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ

کیا تم یہ گمان کئے ہوئے ہو کہ ہم نے تمھیں یونہی بے کار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے ہی نہ جاؤ گے؟

پ ۱۸ ۲۳۔المومنون۱۱۵

۵۹۔ مَتَاعُ الدُّنیَا قَلِیلٌ وَّالآخِرَۃُ خَیرٌ لِّمَنِ اتَّقیٰ وَلَا تُظلَمُونَ فَتِیلاً

دنیا کی سود مندی تو بہت ہی کم ہے اور پرہیزگاروں کے لئے تو آخرت ہی بہتر ہے اور تم پر ایک تاگے کے برابر بھی ستم روا نہ رکھا جائے گا۔

پ ۵ ۴۔النساء ۷۷

۶۰۔ "الدنیا مزرعة الاخرة"

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کُھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز!
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز!
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز!
"عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز!"

اقبال

باب دوم

چند کرداری مباحث

اخلاص

وہ شے کیا ہے، جسے اِس کائنات کے خالق نے کائنات کی رگ رگ میں مستور کررکھا ہے......؟ اس کا نام لیا جائے تو وہ بھی ایک لفظ ہے، ہوا، پانی، مٹی کی طرح، ان لفظوں میں سے ایک لفظ جنھیں ہم بار بار سنتے ہیں لیکن شاید ان پرغور نہیں کرتے......لیکن اگر یہ نہ ہوں تو زندگی بھی نہ ہو......ہوں نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو۔

وہ لفظ......چار حروف کا مجموعہ، ''محبّت'' ہے......جی ہاں یہ سارا کارخانہ محبت ہی کی اساس پر قائم ہے، محبت ایک زرّیں سِلک ہے جو اِنسانوں سے لے کر انسانوں کے خالق تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔۔۔

کسی بھی شے کو پانے کے لئے، اِس کے مطالبات پورے کرنا ہوتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ محبت جیسی بہا شے کی کوئی قیمت نہ ہو اور وہ یونہی حاصل ہو جائے؟

جی نہیں!......محبت

شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنون باشی

(پہلے ہی قدم پر یہ شرط عائد ہوتی ہے کہ تو مجنون ہو)

کے مطالبے کی مظہر ہے......محبت یکسوئی کا مطالبہ کرتی ہے، تو جہات کو مرتکز دیکھنا چاہتی ہے، انتشار، کثرت، تغیر؛ محبت کے دشمن ہیں۔

اپنی تو جہاں آنکھ لگی پھر وہیں دیکھو

آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

ہم چھوٹی چھوٹی محبتوں میں مبتلا رہتے ہیں......انجام دل شکنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے پھر ہم پکار اٹھتے ہیں کہ چیزوں کو دل سے نہیں چاہنا چاہئے......لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنی محبت کے مرکز کو جان لیں، پھر مایوسی نہیں ہوگی......محبت حسن سے جنم لیتی ہے، حسن کیا ہے......؟ توازن، حسن ہے، اعتدال، راستی، اخلاص حسن ہیں۔

وہ جس نے زمین پر پیار اتارا ہے وہ جو محبتوں کا خالق ہے، وہ جو خود سب سے پیارا ہے، وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے:-

وہ ہمیں راستی اور انصاف کا حکم دیتا ہے، وہ کہتا ہے اپنا رُخ ٹھیک کر لو اور اپنے طریقے کو خالص کر لو۔ (مفہوم [1])

راستی، اعتدال، توازن، انصاف......یہی تو حسن ہے!

لیکن یہ حسن، کہاں ہے؟

اِس حُسن کا سراغ، اِس حسن کا خالق خود دے رہا ہے، وہ سراغ یہ ہے:

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ

(پس تم اللہ ہی کی بندگی کرو، دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے) ۲

جب دین خالص ہو جائے گا تو عبادات میں خلوص آجائے گا، پھر یکسوئی حاصل ہو جائے گی، پھر محبتوں کے نتیجے میں صدمہ نہیں پہنچے گا، پھر مسرّت، فوز اور فلاح ہمارا انتظار کرے گی لیکن شرط وہی ہے کہ دل، آئینہ خانہ نہ ہو بلکہ اس میں ایک ہی تصویر سجی ہوئی ہو...... جب ایک تصویر دل میں سج جاتی ہے تو باقی سب نقش مٹ جاتے ہیں ۔

نہ یک دل در دو دلبر رہ کند گم

نہ در یک دیدہ در گنجد دو مردم — امیر خسرو

(ایک دل دو محبوبوں میں گم ہو سکتا ہے نہ ایک آنکھ کے اندر دو پتلیاں ہو سکتی ہیں)

یہ پیغام نیا نہیں...... عالمِ انسانی کو شروع ہی سے یہ بات سمجھائی جا رہی ہے، سورۃ البینہ میں ارشادِ ربانی ہے:-

(پہلے لوگوں کو) اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے ۳

زرا ارضی سطح پر آ کر سوچیے...... کوئی محبوب ایسا ہدیہ قبول کر سکتا ہے جس میں اس کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک بنایا گیا ہو......؟

وہ تو کسی دوسرے کا تذکرہ بھی گوارہ نہیں کرتا کجا ایسے تحفے کی قبولیت جس میں شائبۂ غیر پایا جائے...... یہی حال اللہ کی محبت کا ہے، رسول کریم ﷺ

سے (ابن مردویہ نے یزید الرقاشی سے نقل کیا ہے) ایک شخص نے پوچھا:
یا رسول اللہ ﷺ! ہم اپنا مال دیتے ہیں کہ ہمارا نام بلند ہو، کیا ہمیں اس پر اجر ملے گا......؟ رسول کریمؐ نے فرمایا:۔ نہیں...... پھر پوچھا گیا: اگر اللہ کے اجر اور دنیا کی ناموری دونوں کی نیت ہو......؟ فرمایا: اِنَّ اللّٰہ لایقبل اِلّا مَن اخلص لہٗ اللہ کوئی عمل بھی قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص اس کے لئے نہ ہو۔ اَلَا لِلّٰہِ الدِّینُ الخَالِصُ ۴ خبردار دین خالص اللہ کا حق ہے۔

اسی سورہ مبارکہ (الزمر) میں ارشاد ہوتا ہے اِنِّی اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَاللّٰہَ مُخلِصًا لَّہُ الدِّینَ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس کی بندگی کروں ۵ وہ لوگ جو دین کو اللہ کے لئے خالص نہیں کرتے، عبادت میں خلوص کی منزل کو کیسے پا سکتے ہیں، عبادت میں خلوص وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَا لاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن (جنوں اور انسانوں کو تو اللہ کی عبادت ہی کے لئے پیدا کیا گیا) ۶ کے شعور کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے...... وہ لوگ جو تھک ہار کر بلکہ فقدانِ ہمت کے باعث اس منزل سے کہیں پیچھے رہ جانے والے ہیں ان کے بارے میں قرآنِ کریم کا قولِ فیصل ہے۔

وہی ہمارا رب ہے اور تمھارا بھی، ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لئے اور ہم اللہ ہی کے لئے اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں ۷ یہ گویا لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۸ کا اعلامیہ ہے...... تمھارے لئے تمھارا طریقہ، ہمارے لئے ہمارا طریقہ...... ہمارا طریقہ کیا ہے......؟ ہمارا طریقہ نگاہ کو حسنِ ازل پر مرتکز کر دینے کا طریقہ ہے جس سے عبادت، کردار اور شخصیت میں راستی

پیدا ہوتی ہے، زندگی میں رفتہ رفتہ اعتدال آتا ہے توازن کی منزل ملتی ہے۔

عبادت کا رُخ ٹھیک ہو جائے تو مقصدِ حیات سے آشنائی ہو جاتی ہے مقصد سے آشنائی، منزل کا شعور ہی نہیں بخشتی، منزل تک پہنچا بھی دیتی ہے...... پھر کیوں نہ خود کو اس رنگ میں رنگ لیا جائے جس سے اچھا کوئی رنگ نہیں ہے:-

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ [9]

حوالے:

۱۔	پ۸	۷ الاعراف ۲۹
۲۔	پ۲۳	۳۹ الزمر ۲
۳۔	پ۳۰	۹۸ البینہ ۵
۴۔	پ۲۳	۳۹ الزمر ۲
۵۔	پ۲۳	۳۹ الزمر ۱۱
۶۔	پ۲۷	۵۱ الذاریات ۵۶
۷۔	پ۱	۲ البقرہ ۱۳۹
۸۔	پ۳۰	۱۰۹ الکافرون ۶
۹۔	پ۱	۲ البقرہ ۱۳۸

استقامت

امرِ الٰہی کے ساتھ عناصر میں ظہورِ ترتیب سے جنم لینے والی زندگی ایک کم فرصت آبگینے کی طرح ہے، جو ہر دم اُس ٹھیس کی زد میں رہتا ہے جو اس کے اجزائے ترکیبی کو پریشان کردیتی ہے...... آپ اس آبگینے کو، اِس کی ہستی بکھیر دینے والے حادثے سے جتنا بھی بچا کر رکھیں، اسے بالآخر ایک دن پھوٹ بہنا ہے...... کیا ہی اچھا ہو اگر مختصر دورانیے کے لئے عطا ہونے والے اس حسین آبگینے کو حیات و کائنات کے بام و در سجانے اور سنوارنے کے لئے استعمال کرلیا جائے۔

مقصد آشنا ہوجانے والی زندگی ان لوگوں کی زندگیوں سے بہت ممتاز اور منفرد ہوجاتی ہے جو اسے ایک فٹ بال کی طرح سمجھتے ہیں، جسے زمانے کے قدموں کی

ٹھوکریں دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں بھاگنے پر مجبور کیے رکھتی ہیں اور نتیجہ سوائے شکستوں ضربوں، کھنگی اور اضمحلال کے کچھ بھی نہیں نکلتا۔

مقاصد زندگی کو تڑپ عطا کرتے ہیں، تڑپ، امنگ، ولولے، انسان کو ایک خاص سمت میں آگے بڑھنے اور منزل پالینے کی مسرت بخشتے ہیں۔

مقاصد کچھ بھی ہو سکتے ہیں......لیکن اگر مقصود حق وصداقت کی تلاش اور حقیقت کا عرفان ہو تو کیا کہنے ......سچائی کا طلب گار، حقیقتِ ازل کے رازوں کا آرزومند کبھی نامراد نہیں ہوتا......وہی حقیقت اور وہی عرفان جو اس کائنات کی رگوں میں خون کی طرح محوِ گردش ہے اگر ہم دنیا میں سچائی کے غلبے، انصاف، مساوات، عدل، محبت اور اخلاص کی مساعی کو اپنا مقصد حیات قرار دے لیں تو سوال پیدا ہوگا کہ کیا ہماری یہ مساعی ثمر ور بھی ہو سکتی ہے......؟

جی ہاں، ایسا ہو سکتا ہے لیکن ہر چیز کی طرح اس ثمر وری کی بھی ایک قیمت ہے، جو حق وصداقت کی راہ اختیار کرنے والوں کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

سامانِ دنیا خریدنے کے لئے تو چند روپوں کی قیمت ہوتی ہے، امتحان پاس کر لینے کے لئے کچھ شب وروز کی اور سیر وسفر کے لئے وقت جان اور سرمائے کی۔۔اس راستے کی کیا قیمت ہے؟

اس راستے کی قیمت، راستی اور راستوں کا شعور بخشنے والے نے خود ہی بتا دی ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ

(اور ہم ضرور تمھیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمائش کریں گے) [1]

گویا اس راستے کو اپنی منزل بنا لینے والوں کو خوف، خطرات، بھوک جانی اور مالی نقصانات اور سب پر مستزاد دنیوی اعتبار سے احساس زیاں کے لئے تیار رہنا چاہئے...... اگر آپ ان سب کو خاطر میں نہیں لاتے تو مبارک باد قبول کیجئے، آپ کامیاب ہیں...... لیکن اس انسانی نفسیاتی کیفیت کا کیا کیجئے جو اسے جلد جلد نتائج کا تمنائی بنا دیتی ہے، وہ اپنی مساعی کا پھل فوراً ہی پانا چاہتا ہے...... وہ جانی و مالی نقصانات سے گھبرا جاتا ہے، خطرات سے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور بار بار فیصلوں پر نظر ثانی کرتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ انسان بھول جاتا ہے کہ یہ مشکلات اس کے فیصلے اور ارادے کی پختگی کو جانچنے کے لئے وارد کی جاتی ہیں جیسے طالوت نے اپنے لشکریوں کو (غالبًا) دریائے اُردن کے کنارے اترنے کے باوجود اس کا پانی پینے سے روک دیا تھا اور کہا تھا "فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّیْ" (جو اس کا پانی پیے گا وہ میرا ساتھی نہیں) [2] وہ اپنے لشکر کو پیاسا نہیں رکھنا چاہتا تھا اگلی منزل پر انھیں پانی مل جانا تھا درحقیقت وہ کھروں کو کھوٹوں سے جدا کرنا چاہتا تھا کہ جو لوگ کچھ دیر کی پیاس پر قابو نہ پا سکیں وہ حق وصداقت کے لئے جانوں کا نذرانہ پیش نہیں کر سکتے۔ قرآن حکیم نے ایسے بہت سے واقعات بیان کئے ہیں جن میں اہل ایمان کی آزمائش کا ذکر ہے جو آزمائشوں کی حقیقت کو منکشف کرتے ہیں اور دلوں کو تقویت عطا کرتے ہیں۔ [3]

تاریخِ اسلام میں صبر واستقامت کی ایک روشن مثال واقعہء کربلا بھی ہے جس میں حق وصداقت کا راستہ اختیار کر لینے کے بعد، کسی نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، کوئی گھبراہٹ، پریشانی اور نقصان، راستے کی طرف رکاوٹ نہیں بن سکا اور ظاہری اسباب کی ناموافقت کے باوجود کامیابی شہدائے کربلا کا مقدر ٹھہری۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جس جگہ اہل ایمان کے لئے، ان کے فیصلے کے بعد آزمائشوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی مقام پر ثابت قدم رہنے والوں کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں اور بتایا ہے کہ صبر کرنے والے ہر نقصان پر اس بات کا اقرار واظہار کرتے ہیں کہ اُن کا سب کچھ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے، وہ بھی جو اِن سے واپس لے لیا گیا اور وہ بھی جو اِن کے پاس رہنے دیا گیا اور انھیں بالآخر اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ؂

اللہ کو خوب معلوم ہے کہ انسان کا دل دنیوی ترقی کی دعاؤں سے تو نہیں بھرتا وہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری منزل کا طلب گار رہتا ہے۔ ؂ لیکن اسے زراسی تکلیف پہنچ جائے تو مایوس اور پریشان ہو جاتا ہے۔۔ اس مایوسی اور پریشانی سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر اہل ایمان سے کہا ہے کہ وہ اللہ سے دعا کریں کہ وہ ان کے دلوں کو ہدایت پا لینے کے بعد کجی کی طرف نہ لے جائے ؂ اور اللہ ہم پر صبر کا جام انڈیل دے اور ہمارے قدم جمائے رکھے ؂ اور ہمیں کینہ بغض جھوٹ، ناانصافی، فساد اور لڑائی جھگڑوں کے مقابلے میں راہِ حق پر، جو امن وسلامتی کی راہ بھی ہے، ثابت قدم رکھے۔

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق

باشد بقدرِ ہمّتِ تو اعتبارِ تو

(ترجمہ: ہمت بلند رکھو کہ خدا اور مخلوقِ خدا کی نگاہوں میں تمھارا اعتبار تمھاری ہمت کے مطابق ہوتا ہے)

حوالے:

۱۔ پ ۲ ۲ البقرہ ۱۵۵

۲۔ پ ۲ ۲ البقرہ ۲۴۹

۳۔ پ ۱۳ ۱۲ یوسف ۱۱۱

۴۔ پ ۲ ۲ البقرہ ۱۵۶

۵۔ پ ۲۵ ۴۱ حم السجدہ ۳۹

۶۔ پ ۳ ۳ آل عمران ۸

۷۔ پ ۲ ۲ البقرہ ۲۵۰

صبر

اسلام کی اخلاقی تعلیمات تین حصوں میں منقسم ہیں (i) حقوق وفرائض (ii) فضائل ورذائلِ اخلاق اور (iii) آداب [1]

صبر واستقامت کا تعلق فضائلِ اخلاق سے بھی ہے اور آدابِ زندگی سے بھی، صبر سے مراد ہے رُک جانا، توقف کرنا، اپنے فوری ردِعمل پر قابو پالینا، استقامت کا مطلب ہے، سیدھا چلنا، مداومت کرنا، قائم رہنا۔

صبر کی ضرورت عام طور پر مشکل اور تکلیف دہ حالات میں محسوس کی جاتی ہے لیکن صبر، جیسے مشکلات اور رنج والم کے مواقع پر مطلوب ہوتا ہے، ویسے ہی خوشی اور کامیابی کے اوقات میں بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے، عام انسانی زندگی اور

پیغمبروں کی زندگی میں آنے والی مشکلات میں مقدار اور معیار دونوں کا فرق ہے ایک بار ایک صحابیؓ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ (دنیا میں) سب سے زیادہ مصیبت کس پر آئی......؟ تو آپؐ نے فرمایا: پیغمبروں پر، اور پھر درجہ بدرجہ لوگوں پر۔

انبیاء کرام علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ شدائد اور آلام کا سامنا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کرنا پڑا، اسی تناظر میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ

(آپؐ بھی صبر کیجئے جیسے آپ سے پہلے اولوالعزم رسول صبر کرتے رہے ہیں اور اُن کے معاملے میں جلدی نہ کیجئے) ۲

جس طرح صبر کی مطلوب صورت حال کو ہم نے مشکلات اور مسرت کے دو خانوں میں تقسیم کیا ہے، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آنے والی مشکلات کو بھی ذاتی زندگی میں آنے والی مشکلات اور اجتماعی زندگی کی مشکلات کے دو عنوانات کے تحت مطالعہ کیا جا سکتا ہے، آپؐ اپنی زندگی میں اوائل عمر ہی سے صدمات اور دکھوں سے آشنا ہو گئے تھے، والد کی رحلت، کم سنی میں والدہ کی شفقت کا اٹھ جانا، مہربان اور شفیق دادا کا انتقال، چچا کے تعاون اور اخلاقی حمایت کا ان کے انتقال کے باعث خاتمہ۔

اس کے بعد ازدواجی زندگی میں امّ المومنین حضرت خدیجہؓ کا انتقال فرما جانا، آپؐ کی اولادِ نرینہ کا زندہ نہ رہنا، آپؐ کے موردِ شفقت و محبت حضرت زیدؓ اور

عم زاد حضرت جعفرؓ، حضرت عباسؓ، حضرت حمزہؓ کی شہادت اور اس طرح کے بہت سے دوسرے واقعات اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنے شدید ہیں کہ انسان کا پیمانہ صبر کسی وقت بھی جھلک سکتا ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام حوادث، تکالیف اور آلام پر بے پناہ صبر و استقامت کا مظاہرہ فرمایا۔

اسی طرح کامیابی اور کامرانی کی کیفیتوں میں آپؐ صبر کی تصویر بنے رہے، فتح مکہ جیسے کامیابی کے بے مثال واقعے پر بھی آپؐ نے انتقام کا راستہ اختیار نہیں فرمایا، خود کو تکلیف پہنچانے والوں کے ساتھ بھی نرمی، رحم اور درگزر کا معاملہ فرمایا اور اظہارِ تفاخر کی بجائے خدا کے حضور شکر ادا کرنے کا راستہ اختیار فرمایا۔

اجتماعی زندگی میں مکی زندگی کے تیرہ برس، طائف کا سفر، غزوات وسرایا کے مرحلے، مخالفین کی عداوت، تحقیر اور استہزا کا سامنا کچھ معمولی مشکلات نہ تھیں، جن پر آپؐ نے مسلسل صبر کا مظاہرہ فرمایا اور کبھی حرفِ شکایت کو زبان پر آنے کا موقع نہیں دیا اور اپنے راستے پر مسلسل آگے بڑھتے چلے گئے۔

حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ آپؐ کا عمل جھڑی کی طرح ہوتا تھا جیسے وہ ایک بار شروع ہو جائے تو تھمتی نہیں ہے اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس بات یا عمل کو ایک بار اختیار کر لیتے تھے پھر ہمیشہ اس طرز عمل کی پابندی فرمایا کرتے، اسی کا نام استقامت ہے آپؐ کا طرز عمل خواہ عبادات ہوں یا معاملات ہر شعبے میں استقامت کی بہترین مثالوں سے بھرا پڑا ہے ایک مرتبہ ایک بڑھیا آپؐ کی خدمت آئی، آپؐ نے اس کے ساتھ غیر معمولی توجہ اور حسن سلوک کا معاملہ فرمایا۔

حضرت عائشہؓ نے اس خصوصی توجہ کا سبب دریافت کیا تو فرمایا عائشہ ! یہ بڑھیا خدیجہؓ کے زمانے سے ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔

آپؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔

آپؐ نے لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه کی دعوت کا آغاز کیا تو ہر طرف سے مخالفت کی آندھیاں چلنے لگیں، لیکن مخالفت، لالچ اور تحریص آپؐ کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈال سکے اور آپ ﷺ کی استقامت کے باب میں لالچ اور تحریص کے جواب میں حضرت ابوطالب کو دیا گیا جواب دنیا کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا کہ اگر کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند بھی دے دیں تو بھی میں اس دین حق سے باز نہیں آؤں گا۔

یہی وہ رویّے ہیں جو اللہ اور اس کا پیارا رسولؐ پیروانِ اسلام کی زندگیوں میں دیکھنا چاہتے ہیں اور انہی رویّوں کے حامل اصحاب کو رنج و غم، خوف سے آزادی اور جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ [۳]

حوالے:

۱۔ سید سلیمان ندوی — سیرۃ النبی اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۸ء ج ۶ ص ۳۰۳

۲۔ پ۲۶ — ۴۶ الاحقاف ۳۵

۳۔ پ۲۶ — ۴۶ الاحقاف ۲

نیز: پ۲۴ — ۴۱ حم السجدہ ۴

پاکیزگی

زندگی کے دو رُوپ بہت واضح ہیں؛ ایک وہ جس کی بنیاد نفاست، نظافت اور پاکیزگی پر ہو اور دوسرا اِس کے برعکس کثافت اور ناپاکیزگی کو اپنی اساس بنانے والا۔ ان دونوں سے متعلق ایک سلیم الفطرت انسان کا ردِّعمل واضح اور معلوم ہے، سلیم الفطرت انسان کے ردِّعمل کی اساس دراصل فطرت کا عمل ہے..... فطرت اور اس کے مظاہر انسان کو جس تصویرِ زندگی سے آشنا کرتے ہیں اس پر ایک نظر ڈالیں:- چاند، ستارے، آسمان، پانی، موتی، رنگ، پھول، پتے، درخت یہ سب کتنے شفاف کتنے پاک اور صاف ہیں، ان کی نفاست زندگی کے منظرنامے کو حسین بنا رہی ہے۔ انسان اس حسن کی تکمیل کرتا ہے۔ فطرت نے اس تصویر کے جو گوشے، زاویے مستور رکھے

ہیں انسان انھیں منکشف کرتا ہے۔

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

تکمیلِ فطرت کا یہ فریضہ انجام نہیں دیا جا سکتا جب تک انسان خود نفاست و نظافت کا پیکرِ جمیل نہ بن جائے۔ یہ نفاست و پاکیزگی ظاہر میں بھی درکار ہے باطن میں بھی خورونوش میں بھی اور کردار میں بھی۔

ظاہر، بدن اور لباس سے عبارت ہے، بدن کی طہارت دل کو مطہر کرتی ہے اور لباس کی صفائی ہمارے انتخاب کو نجاست سے دوری اور غسل، وضو اور طہارتوں کی تلقین، معمولی نہیں بلکہ بہت اہم ہے یہ تلقین اللہ نے اپنے پیارے نبیؐ کو بھی کی اور آپؐ کے وسیلے سے بنی نوع انسان کو بھی:

وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّر وَالرُّ جزَ فَاهْجُرْ

(اور اپنے کپڑے پاک صاف رکھو اور گندگی سے دور رہو) [1]

دراصل اللہ یہی چاہتا ہے کہ وہ (ہم سے ہر طرح کی) نجاست کو دور کر دے اور (ہمیں) بخوبی پاک (صاف) کر دے۔ [2]

کیونکہ وہ پاکیزگی کو پسند کرتا ہے۔ اس کی صفائی پسندی کا (جو یوں تو محتاج دلیل و وضاحت نہیں) اندازہ ان آیات سے بھی کیا جا سکتا ہے جن میں نبی کو (بگمانِ غالب) مسجد قبا میں نماز ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور اساسِ تقویٰ پر استوار ہونے والی مسجد میں آپؐ کے قیام کو اس کا حق قرار دیا گیا [3] اور فرمایا:

اس (مسجد) میں ایسے لوگ ہیں جو پاک (صاف) رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ بھی پاک (صاف) رہنے والوں کو پسند کرتا ہے ؏

روایت میں ہے کہ نبیؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد اہل قبا سے دریافت فرمایا کہ وہ پاکیزگی کا ایسا کون سا خاص طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں جس کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے۔تو معلوم ہوا وہاں کے لوگ طہارت کا بہت اہتمام کرتے تھے یہ ظاہری طہارت و نفاست، براہ راست انسان کے باطن پر اثر انداز ہوتی ہے آپ ظاہر میں جس قدر صاف ستھرے ہوں گے، آپ کے داخل میں بھی اس صفائی کا عکس جلوہ ریز ہوگا۔عبادت میں انہماک کے لئے بھی ظاہر میں اہتمام طہارت ضروری ہے، ایسا نہ ہو تو عبادت بھی انسانی باطن پر اثر انداز نہیں ہوتی ۔عبادت اگر باطن پر اثر انداز نہ ہو تو انسان کو روحانی رفعت و سربلندی حاصل نہیں ہو سکتی ۔اور جسے روحانی رفعت نہ ملی اسے دنیا میں اور بہت کچھ مل بھی گیا تو کیا ملا......؟

گویا ظاہر کی پاکیزگی سے دل و دماغ کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔دل و دماغ پاکیزہ ہوں گے تو انسان کے خیالات تصورات، جذبات اور احساسات پاکیزہ اور راست ہوں گے۔یہ پاکیزگی اور راستی کامیابی کی ضمانت بن جائے گی۔

جس طرح ایک صاف ستھرے مہمان کے لئے اس کے قیام کی جگہ کو صاف کیا جاتا ہے اور صفائی پسند مقیم، ناپاکیزہ جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی جو صفائی اور پاکیزگی سے محبت کرنے والا ہے۔۔ایک ایسے دل میں جس میں صاف ستھرے خیالات اور پاکیزہ جذبات نہ ہوں، اتر نا پسند نہیں کرتا۔اچھا خیال

بھی خانہءدل کے ایک مہمان کی مانند ہوتا ہے اگر آپ اپنے خانہءدل کو اس سے آباد رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی منزل کو صاف ستھرا رکھیں۔

پاکیزگی بدن اور لباس کی طرح غذا میں بھی مطلوب ہے۔۔ اللہ چونکہ صفائی کو گندگی سے تمیز کرنا چاہتا ہے اس لئے اس نے کھانے پینے میں حلال اشیا کے انتخاب کی ہدایت کی، حلال کیا ہے......؟ جو پاکیزہ ہے۔

حلال روزی ہمارے دل و دماغ کو روشنی عطا کرتی ہے کہ دین کا اصل الاصول دو ہی باتیں ہیں؛ سچ بولنا اور حلال روزی کھانا جن سے خلوت وجلوت میں جمالِ الٰہیٰ کا جلوہ دکھائی دیتا ہے ۔

سرِّ دیں صدقِ مقال اکلِ حلال
خلوت و جلوت تماشای جمال

پاکیزگی کا سب سے اہم زاویہ، پاکیزگیءکردار ہے۔ قرآن کریم نے جسے ''حفظِ فروج'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی شرم گاہوں کی حفاظت

جھوٹ، نفاق، بغض، عداوت، کینہ، تکبر وغیرہ یہ سب خرابیِ کردار کے مظاہر ہیں، سب سے بڑی خرابی، حفظِ خروج کی ضد فاحشہ ہے یعنی ایسے کام جو پاکیزگیِ کردار کے منافی ہوں۔ اسے قرآن حکیم نے بڑی برائی اور برا چلن قرار دیا ہے ۵

اس سے بچنے کے لئے ......نگاہوں کے خالق نے نگاہوں کی حفاظت کی تلقین ۶ کی ہے کہ نگاہ اس دروازے کی مانند ہے جس سے گزر کر خرابی دل میں گھر کرتی ہے اور پھر انسان غلاظت میں لت پت ہو جاتا ہے۔

صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی دراصل نیک اعمال اور اچھے کردار کا ثمر ہوتی ہے صاف ستھری زندگی کا ثمر کیا ہے......؟ صاف ستھری زندگی کا ثمر : مغفرت اور عزت والا رزق ہے [۷] اللہ کی محبوبیت ہے [۸] اور اس کی نعمتوں کا اتمام ہے [۹] یعنی کامیابی، یہاں بھی اور یہاں سے رُخصت ہو جانے کے بعد بھی......

حوالے:

۱۔ پ ۲۹ ۷۴ المدثر ۴،۵

۲۔ پ ۲۲ ۳۳ الاحزاب ۳۳

۳،۴۔ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔)

پ ۱۱ ۹ التوبہ ۱۰۸

۵۔ پ ۱۵ ۱۷ بنی اسرائیل ۴

۶۔ پ ۱۸ ۲۴ النور ۳۰،۳۱

۷۔ پ ۱۸ ۲۴ النور ۲۶

۸۔ پ ۱۱ ۹ التوبہ ۱۰۸

۹۔ پ ۶ ۵ المائدہ ۶

مطابقت
(قول اور فعل میں)

انسانوں کو کسی پسندیدہ راستے کی طرف بلانے اور کسی ناپسندیدہ راستے سے احتراز پر مائل کرنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں:

۱۔ اچھے اور پسندیدہ راستے پر آجانے اور ناپسندیدہ راہوں سے بچ کر چلنے کی تلقین و نصیحت کی جائے۔

۲۔ نقصان رساں راہوں پر چلنے سے نرمی یا سختی کے ساتھ روک دیا جائے۔

۳۔ پسندیدہ راہوں پر چلنے کی صورت میں انعام اور ناپسندیدہ راہیں اختیار کرنے کی صورت میں سزا کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

یہ تمام طریقے اپنے اپنے مقام پر بجا اور ان کی افادیت مسلّم لیکن ایک طریقہ ایسا بھی ہے جو کسی پسندیدہ راستے کے لئے تلقین و تبلیغ، زجر و توبیخ، جزا و سزا سے بڑھ کر ہے۔

آپ کے پاس ایک تصور رہے، ایک خیال ہے، ایک ایسا نظریہ ہے جو آپ کے خیال میں اگر دوسرے اختیار کرلیں تو ان کے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے......آپ خود اس پر عامل ہو جائیں۔

آپ دیکھیں گے کہ ایک اونس عمل ایک ٹن تلقین پر بھاری ثابت ہوگا، ایسا کرنا ضروری بھی ہے، اس لئے کہ ہم دوسروں سے جو توقعات وابستہ کرتے ہیں پہلے خود تو ان پر پورے اتریں......ہم جو تبدیلی دوسروں میں چاہتے ہیں وہ تبدیلی خود اپنے اندر تو پیدا کریں۔

اگر ہم دوسروں کو ایک بات کی تلقین کرتے رہیں لیکن خود اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو ہماری بات تاثیر سے محروم ہو جائے گی...... ہماری شخصیت میں وہ توازن نہیں رہے گا جو قول اور عمل کی مطابقت سے پیدا ہوتا ہے، قول اور عمل کی مطابقت، شخصیت کو وحدت عطا کرتی ہے جب کہ ان میں پائی جانے والی مغائرت، مضائف شخصیت (Multiple Personality) کی تشکیل کرتی ہے۔

اللہ کی آخری الہامی کتاب......قرآن حکیم......میں قول اور عمل کی مطابقت کو ایک سے زائد مقامات پر موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔

۱۔ سورۃ الشعرا میں قول اور عمل کی عدم مطابقت کو گمراہوں کی پیروی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۔ سورۃ البقرہ میں اسے نادانی اور بے عقلی کی بات قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ سورۃ الصّف میں اسے اللہ کی ناراضگی کا سبب بننے والی بات کہا گیا ہے۔

''الشعرا'' میں یہ بات ان شعرا کے حوالے سے آتی ہے جو باطل کی پیروی کرتے ہیں اور بلا امتیاز ہر سمت میں چل پڑتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَاَ نَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ٥ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ ٥

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں [۱]

ایسے لوگ زندگی کا کوئی رُخ متعین نہیں کرتے، وہ کسی بڑی منزل کی آرزو نہیں کرتے وہ بہت کچھ کہتے ہیں لیکن جو کہتے ہیں خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

اَتَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟ [۲]

سورۃ الصّف میں ایمان کے تقاضوں کی ادائیگی میں تساہل برتنے والوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ٥ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ٥

اے ایمان والو تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں ہو......!

قول وفعل کا تضاد ایک سطح پر پہنچ کر عمل کی خیانت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ خیانت اور جھوٹ ناپسندیدہ ترین اعمال ہیں جو انسان کو منافقت تک پہنچا دیتے ہیں۔

صفوانؓ بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریمؐ سے دریافت کیا کہ۔ مسلمان ناتوان بھی ہو سکتا ہے؟

رسول کریمؐ نے فرمایا: ہاں ہو سکتا ہے

انھوں نے پوچھا: بخیل بھی ہو سکتا ہے؟

فرمایا: ہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

پھر انھوں نے پوچھا: جھوٹا بھی ہو سکتا ہے؟

فرمایا:......نہیں مسلمان جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا کہ: مومن ہر خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے مگر خیانت کاری اور جھوٹ پر نہیں۔

اللہ نے منافقین کی جس سب سے بڑی خرابی کی گواہی دی ہے وہ یہی جھوٹ ہے یعنی وہ زبان سے کچھ کہتے ہیں اور ان کا عمل کچھ اور ظاہر کرتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ

اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں

جھوٹ، نفاق کی راہ دکھاتا ہے اور نفاق سے جھوٹ کے سوا کیا ظاہر ہو سکتا ہے؟ عربی زبان کی مثل ہے

كلّ اِءِ نَاءِ يَتَرَشَّحُ بِمَافِيهِ

ظرف میں جو کچھ ہوتا ہے، وہی اس سے باہر آتا ہے فارسی کے ایک شاعر (بابا افضل الدین کاشانی) نے اسی بات کو یوں نظم کیا ہے:

گر دائرۂ کوزہ ز گوہر سازند

از کوزہ ہمان برون تراود کہ در اوست

(کوزے کا محیط اگر موتیوں سے بھی تیار کیا جائے تو بھی کوزے سے باہر وہی چیز ٹپکے گی جو اس میں ہوگی)

یہاں ابتدائی مرحلے کا امتیاز بہر حال ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ کوئی بھی بات پہلے پہل زبان پر جاری ہوتی ہے، پھر دل میں اترتی اور تب عمل میں ظاہر ہوتی ہے ۔۔ زبان سے کہہ دینے کی اپنی اہمیت ہے مگر ساری عمر زبان ہی سے کہتے رہنا اہم نہیں ہے اس بات کو دل ونگاہ کی تبدیلی کا سبب بھی بننا چاہیئے، جب دل ونگاہ میں صداقت جلوہ ریز ہو جاتی ہے تو کردار کا حسن ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جہاں زبان، دل کی ترجمان ہوتی ہے وہاں دل کا خیال ہی عمل کا کمال بن جاتا ہے اور جب عمل دل سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے تو بات میں تاثیر، عمل میں قوت اور زندگی میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے، پھر آپ کی زبان سے نکلی ہوئی بات زمانوں اور زمینوں کی سرحدوں کو عبور کرتی ہوئی آگے سے آگے پہنچ جاتی ہے وہ خوشبو کی طرح ہوتی ہے جس کا راستہ نہیں روکا جا سکتا ایسی بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے: از دل خیزد بر دل ریزد

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

خوالے:

۱۔ پ ۱۹ ۲۶ الشعرا ۲۲۶
۲۔ پ ۱۵ ۱۷ بنی اسرائیل ۴۴
۳۔ پ ۲۸ ۶۱ الصف ۲،۳
۴۔ پ ۲۸ ۶۳ المنفقون ۱

تشکر

جو چیزیں زندگی کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہیں، اظہارِ تشکر بھی ان میں سے ایک ہے، آپ شکریہ ادا کرتے ہیں تو زندگی سے متعلق آپ کے شعور کی بلند سطح منکشف ہوتی ہے، فاصلے کم ہونے لگتے ہیں، احسان، اکرام اور اعزاز میں اضافہ ہونے لگتا ہے، ایسا شکریہ جس کی جڑیں دامنِ دل میں پیوست ہوں سبع سنابل کی طرح شاخ در شاخ پھیلتا چلا جاتا ہے اور زندگی میں پھول کھلنے لگتے ہیں۔

شکریہ اقرار بھی ہے، اظہار بھی۔ آپ اپنے محسن کے احسان کا ادراک کرتے ہیں، گویا احسان کا اقرار کرتے ہیں، یہ اقرار لفظوں میں ڈھل کر زبان سے ادا ہوتا ہے، عمل سے چھلکتا ہے، تو اظہار بن جاتا ہے، گویا اقرار کا اظہار ہو جاتا ہے۔

شکریہ کے دو مدارج ہیں، بندوں کے لئے آپ کے جذباتِ تشکر اور اپنے خالق کے لئے۔ بندوں کا شکریہ ادا کرنا دراصل خالق کا شکریہ ادا کرنے کی تربیت کا عمل ہے، جو بندوں کا شکریہ ادا کرنا سیکھ لیتا ہے وہ اللہ کا شکریہ ادا کرنا بھی سیکھ لیتا ہے اور جو بندوں رلوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا۔

شکریہ کیسے ادا کیا جاتا ہے۔۔؟ شکریہ کی ادائیگی کی تین سطحیں ہیں، سب سے پہلے دل میں احسان مندی کے جذبات پیدا ہوں، پھر زبان سے ان جذباتِ تشکر کا اظہار کیا جائے اور پھر آپ کا عمل، دل کے جذبات اور زبان کے اظہار سے آمیز ہو جائے تب شکریہ کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔

اظہارِ تشکر سے ربط وضبط میں حرارت اور اعمال میں قوّت پیدا ہوتی ہے، یہی نہیں وہ نعمتیں اور احسانات جو شکریہ کو واجب کرتے ہیں، تشکّر کے معرضِ اظہار میں آجانے سے ان میں اضافہ ہونے لگتا ہے، اگر ایسا نہ ہو، جذباتِ تشکر نہ ہوں، اظہارِ تشکر نہ ہو تو حاصل نعمتیں بھی رفتہ رفتہ چھنتی چلی جاتی ہیں۔

شکرِ نعمت ، نعمت افزوں کند
کفر نعمت از کفت بیروں کند

(نعمت کا شکر تیری نعمتوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے جب کہ ناشکری نعمت کو تیری دسترس سے دور کر دیتی ہے)

اظہارِ تشکر کا تعلق تاریخ سے بھی ہے، آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ اظہارِ تشکر کا تاریخ سے کیونکر ناطہ جوڑا جا سکتا ہے......؟ جی ہاں! تاریخ سے سبق

اندوزی کے لئے جس دل ودماغ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اظہارِ تشکر کی ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، شکر کرنے والا دل، دراصل قدر کرنے والا دل ہوتا ہے، نصیحت پکڑنے والا دل ہوتا ہے، حضرت موسیٰؑ نے اپنی وفات سے چند روز قبل بنی اسرائیل سے جو خطاب کیا تھا اس میں انھیں مائل بہ تشکر کرتے ہوئے تاریخ کے واقعات ہی یاد دلائے تھے اللہ کے انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"اگر تو خدا کی بات کو جان فشانی سے مان کر اس کے سب حکموں پر عمل کرے تو...... خدا تجھے دنیا کی سب قوموں سے زیادہ سرفراز کرے گا، سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی ...... تیرے سب کاموں میں برکت ڈالے گا اور اگر ایسا نہ کرے گا تو آسمان جو تیرے سر پر ہے پیتل کا اور زمین جو تیرے نیچے ہے لوہے کی ہو جائے گی" [1]

قرآن کریم میں بھی شکر کے باب میں تاریخ الٰہی کا حوالہ دیا گیا ہے، سورہ ابراہیم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے:

تاریخِ الٰہی کے سبق آموز واقعات سنا کر نصیحت کیجئے، ان واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں، ہر اس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو" [2]

اظہارِ تشکر کی بہترین مثالیں بھی تاریخِ الٰہی کے انھی واقعات میں ملتی ہیں:

حضرت لقمانؑ کا حکمت ودانائی کی نعمتوں پر اظہارِ تشکر [3] حضرت داؤدؑ کا اپنے اعجازِ نطق پر اللہ کا شکر [4] حضرت نوحؑ کا اللہ کے انعامات پر شکر [5] اور حضرت سلیمانؑ کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عطا کی جانے والی غیر معمولی

صلاحیتوں پر اظہار تشکر وعبودیت، حضرت سلیمانؑ کو جو شان و شوکت عطا کی گئی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ ہی سے کیا جا سکتا ہے جب پلک جھپکنے میں ملکہ ءسبا کا تخت ان کے روبرو لا کر رکھ دیا گیا تھا، اس موقع پر حضرت سلیمان کی زبان دل پر تشکر کے جو کلمات جاری ہوئے، ہمیشہ یادرکھے جانے کے لائق ہیں، آپ نے فرمایا:

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي ءَ أَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ۝

''یہ میرے رب کا فضل ہے تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے'' [6]

لیجئے یہاں یہ حقیقت بھی منکشف ہوگئی کہ شکر کس لئے کیا جاتا ہے۔ شکر دراصل اپنے ہی نفع کا موجب بنتا ہے [7] اللہ اس کا (اچھا) بدلہ دیتا ہے [8] اللہ شکر کرنے والے کی قدر کرتا ہے [9] شکر سے اس کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور ناشکرگزاری کی صورت میں اس کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ جو متحمل ہے مگر دیر گیر ہے وہ جس کی پکڑ بہت سخت ہے۔

اگر کسی مرحلے پر بظاہر، اس کی نعمتوں میں کمی کا احساس ہونے لگے تو جاننا چاہئے کہ فقیری بھی ایک نعمت ہے جو نفس کی سرکشی کو روکنے کے لئے دی جاتی ہے، ایسا نہ ہو تو انسان خودسر ہوتا چلا جائے، اس لئے ایسی حالت میں بھی شکر یہ ہی واجب ہے۔

نفسِ سرکش راتہی دستی عنان داری کند

از فقیری شکوہ کردن ، کفرِ نعمت کردن است

(تہی دستی نفس سرکش کی لگام کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے چنانچہ مفلسی کا شکوہ کرنا کفران نعمت کے مترادف ہے)

یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اُس کی نعمتیں مال و دولت دنیا تک ہی محدود ہیں اس کی نعمتیں بے پناہ ہیں، اس نے آسمان میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنادیا [10] جو ہوا، پانی، مٹی جیسی نعمتوں سے زندگی کی ڈور کو قائم رکھے ہوئے ہے، جس کے کرم سے اندر اترتا ہوا ہر سانس ''ممدِ حیات'' اور باہر نکلتا ''مفرح ذات'' ہوتا ہے...... جس کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت خاتم الانبیا سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ظہورِ اقدس ہے، جن کے ذریعے بنی نوع انسان کو ازلی و ابدی کامیابیوں کی راہ دکھائی گئی ہے۔ اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے بھی دل میں اس کی قدر، زبان سے اقرار اور عمل سے اظہار کی ضرورت ہے یہ سب کچھ ہو جائے تو پھر اللہ کو کیا ضرورت ہے کہ وہ لوگوں کو خواہ مخواہ مبتلائے سزا کرے......؟

مَایَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِکُمۡ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ وَ اٰمَنۡتُمۡ

آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمھیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم اس کے شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو [11]

حوالے:

۱۔	استثنا باب ۲۸/۱۔۳،۲۴	
۲۔	پ ۱۳	۱۴ ابراہیم ۵
۳۔	پ ۲۱	۳۱ لقمن ۱۲
۴۔	پ ۲۲	۳۴ سبا ۱۰
۵۔	پ ۱۵	۱۷ بنی اسرائیل ۳
۶۔	پ ۱۹	۲۷ النمل ۴۰
۷۔	پ ۲۱	۳۱ لقمان ۱۲
۸۔	پ ۴	۳ آل عمران ۱۴۴
۹۔	پ ۵	۴ النسا ۱۴۷
۱۰۔	پ ۱۹	۲۵ الفرقان ۶۲
۱۱۔	پ ۵	۴ النسا ۱۴۷

سفارش

نفسیاتی اعتبار سے کسی انسان کے صحت مند یا مریض ہونے کا جائزہ لینا ہوتو اسے تعلقات کے چند دوائر میں رکھ کر دیکھنا چاہئے۔

ذات، کائنات اور خالق کے ساتھ انسان کے تعلقات میں ایک دائرہ لوگوں کے ساتھ تعلق کا بھی ہے: اپنے معاشرے اور ماحول میں لوگوں کے ساتھ اس کے تعلقات کیسے ہیں؟ وہ لوگوں سے اور لوگ اس سے محبت کرتے ہیں یا نہیں؟ وہ معاملات میں دیانت رو اور ذمہ دار ہے یا نہیں؟ اس کے چمن دل میں دوسروں کے لئے ہمدردی اور خوشیوں کے پھول کھلتے ہیں یا نہیں؟

دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات کی بنیادیں مختلف ہوسکتی ہیں: وہ لوگوں

کو ان کے کمال ، جمال یا مال کی وجہ سے عزیز رکھ سکتا ہے، ان کے ساتھ محبت کرسکتا ہے وہ بے غرضی اور بے لوثی کے ساتھ بھی دوسروں سے تعلق رکھ سکتا ہے، ان سے محبت کرسکتا ہے، ان کے کام آ سکتا ہے اور غالباً یہی انسانی تعلقات کی سب سے عمدہ شکل بھی ہے۔

تعلقات کی ایک کرن تو قرابت داریوں کے سورج سے پھوٹتی ہے، جو قرابت داروں پر حقوق وفرائض کی بہت سی ذمہ داریاں عائد کرتی ہے۔۔اسی سورج کی ایک کرن وہ تعلقات بھی ہیں جن کی اساس کسی خونی رشتے پرنہیں ہوتی ،اسے ہم اخوت سے تعبیر کرسکتے ہیں، حقوق وفرائض کے اعتبار سے یہ تعلقات بھی کم اہم نہیں ہوتے ،امام غزالیؒ نے ایک جگہ لکھا ہے:

قرابت کی طرح اخوت بھی ایک بندھن ہے، جب اخوت وجود میں آئے گی تو ایسے تمام حقوق اور تمام تقاضے ساتھ لائے گی جن کا ایفا ہرحال میں واجب اورضروری ہوگا۔ ایفا کا بڑا مظہر یہ ہے کہ دوست کی ضرورت وحاجت کے وقت انسان اس کے کام آئے۔ [1]

اسلام چونکہ انسانوں کواصول اور ضابطے کی زندگی سکھانا چاہتا ہے اس لئے ہرموقع پراس کا مطالبہ اصول وضابطے کی پاسداری کا ہوتا ہے، وہ بےلوث تعلقات رشتے داریوں اور دوستیوں کو پسند کرتا ہے لیکن ان سب میں آگے بڑھنے کی ایک حد بھی قائم کرتا ہے اوروہ حد ہے........... ''القسط'' یعنی عدل اور انصاف اسلام نہ تو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ آپ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کوراہ دیں اور نہ ہی

اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ آپ اپنے عزیزوں، دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے ایسے مناصب، مقامات اور مفادات کی کوشش کریں جو ان کا حق نہیں ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل اپنے اعزہ، اقربا اور احباب کے مفاد کے لئے سفارش کا رواج عام ہے، ہم اپنے عزیز، دوست یار رفیق کا بھلا چاہتے ہیں بسا اوقات ایسے مقامات پر بھی سفارش سے گریز نہیں کرتے جہاں وہ اس کا مستحق نہیں ہوتا ظاہر ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ عزیز واقارب کی ترقی وفلاح کی خواہش نہ کی جائے۔ نہیں...... ایسا کرنا معیوب نہیں البتہ اس کے لئے اللہ نے ایک اصول بیان کر دیا ہے:

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ [2] اور جب بات کہوتو انصاف کی کہو، اگر چہ (مقابل میں) رشتے دار ہی ہو

گواہی دینی ہو، رائے دینی ہو، فیصلہ کرنا ہو، ہر صورت میں عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے، یہ اصول صرف قرابت داروں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ مقابل میں اگر دشمن بھی ہو تو بھی جادۂ عدل پر چلنے ہی کی تلقین کی گئی ہے...... اسلام اپنے پیروکاروں کے رویّوں میں جو معروضیت، غیر جانبداری اور دیانت روی دیکھنا چاہتا ہے اُس کا اِس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ وہ شدید مخالفتوں میں بھی، اسلام اور کفر کے مقابلوں میں بھی انسانی نفس کو اس کی یک طرفہ روش سے باز رکھنا چاہتا ہے، وہ اسے نفع وضرر کے چھوٹے دائرے سے نکال کر ایک بڑے دائرے میں لے جاتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ کینوس بڑا ہو جانے سے تصویر کے خط وخال میں نمایاں تبدیلی آ جاتی ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اے ایمان والوں تم راستی پر قائم رہنے والے بنو اللہ کی خاطر انصاف کی گواہی دینے والے اور ہرگز کسی قوم کی دشمنی تمھیں جادۂ عدل سے ہٹا دینے کا باعث نہ بنے، عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تمھارے کاموں سے خوب باخبر ہے۔ [۳]

انصاف دوستیوں اور تعلقات کو استحکام بخشتا ہے صرف یہی نہیں انصاف تو دشمنیوں کو دوستیوں میں بدل دیتا ہے...... دیکھئے دشمنیاں کیسے دوستیوں میں بدلتی ہیں:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ

برائی رخرابی کو بہترین طریقے سے دور کرو، پھر تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے بعد اور تمھارے درمیان عداوت تھی گویا کہ وہ تمھارا دلی دوست بن گیا [۴]

آپ نے دیکھا کہ مشکل مرحلے میں بہترین راستہ، جو یقیناً عدل اور انصاف کا راستہ ہے، اختیار کرنے سے دشمنیاں دوستی میں بدل جاتی ہیں پھر اگر آپ غلط سفارش سے رک جائیں گے تو تعلقات میں خلل کیسے واقع ہوگا؟

کسی حق دار کو اس کا جائز حق دلانے کی کوشش معیوب نہیں لیکنجب آپ جادۂ عدل سے ہٹتے ہیں، کسی شخص کی کسی ایسے منصب کے لئے سفارش کرتے ہیں، جس کا وہ اہل نہیں ہے تو آپ کئی طرح کی بے ضابطگی اور ناانصافی کے مرتکب ہوتے ہیں:

☆ آپ اس شخص کی صلاحیتوں کے آگے اپنی سفارش سے بند باندھ دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ مستقبل میں بھی اپنی قوتِ بازو کی بجائے سفارش کی بے ساکھیوں کا محتاج ہو جاتا ہے۔

☆ آپ اس کی خود اعتمادی کو مجروح کر دیتے ہیں، آپ ایک ایسے طریقے سے اس کا بھلا چاہتے ہیں جو بالآخر اس کے لئے نقصان دہ بن جاتا ہے وہ آپ کی سفارش کے نتیجے میں وقتی فائدہ تو حاصل کر لیتا ہے لیکن اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور خودی کے جوہر سے محروم ہو جاتا ہے اور

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

☆ آپ ناجائز سفارش سے حق دار کا راستہ روکتے ہیں، فرد معاشرے میں تنہا تو نہیں رہتا ایک حق دار کا راستہ رُکتا ہے تو کئی حق دار محروم ہو جاتے ہیں

☆ آپ غلط سفارش سے ایک نااہل کا راستہ باز کرتے ہیں...... وہ نااہل اپنی نا اہلی کے جتنے مظاہرے کرے گا جتنے لوگوں کو، اداروں کو نقصان پہنچائے گا، جتنے کام خراب کرے گا، سفارش کرنے والا ان تمام خرابیوں اور نقصانات میں برابر کا شریک ہو گا جس کی غلط سفارش نے اس غلط رو شخص کو اس مقام پر پہنچایا جہاں پہنچ کر اس نے ان جرائم کا ارتکاب کیا چنانچہ جہاں اس غلط رو شخص کو قابل مواخذہ قرار دیا جائے گا وہاں اس کے ساتھ اسے بھی قابل مواخذہ قرار دیا جانا چاہیے، جس نے اس نااہل کی غلط سفارش کی تھی۔

بعض اوقات ہم ایسی صورت حال میں پھنس جاتے ہیں جہاں نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی کیفیت ہوتی ہے سفارش کریں تو اپنے ضمیر کی اور نہ کریں تو دوسروں کی ملامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ایسی صورت میں قرآنِ کریم جس روّیے کی تلقین کرتا ہے وہ صبر کا روّیہ ہے، آپ لوگوں کی ملامت کی پروا نہ کریں، اس پر صبر کا روّیہ اختیار کریں، حٰمٓ السجدہ کی جو آیت کچھ دیر قبل آپ نے ملاحظہ فرمائی اسی میں آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ دشمنوں کو دوست بنا لینے کی صلاحیت ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کو اختیار کرتے ہیں، یہاں صبر مسرّتوں اور کامیابیوں کی نوید بن کر آیا ہے دوسروں کے لئے بھی اور اپنے لئے بھی...... کسی ایک کے نفع کے لئے دوسرے کا ضرر ہمارا مقصود نہیں ہونا چاہیے، اللہ کو ہمارے نفع وضرر کی ہم سے زیادہ خبر ہے، ہمارا کام اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہے، فائدے اور کامیابی کے راستے کھولنا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا

اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار بنو، اللہ کے لئے گواہ بنو اگرچہ تمھارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا، اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو اور اگر گھما پھرا کر بات کرو گے (گواہی میں) یا (عدل سے) گریز کرو گے تو بے شک اللہ تمھارے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔ ۵

حوالے:

۱۔ محمد زکی عبدالسلام مصری، ڈاکٹر: غزالی کا تصور اخلاق مترجمہ نور الحسن خان
لاہور: مکتبہ علمیہ، نومبر ۱۹۵۶ء ص ۳۴۹

۲۔ پ۷ ۶ الانعام آیت ۱۵۲

۳۔ پ۶ ۵ المائدہ آیت ۸

۴۔ پ۲۴ ۴۱ حم السجدہ آیت ۳۴

۵۔ پ۵ ۴ النسا آیت ۱۳۵

کامیابی

انجام سے بے پروائی اور بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کے رویے، شروع ہی سے بے فکروں، فردا ناشناسوں اور نادانوں کے روّیے رہے ہیں، دانا کبھی انجام سے غافل نہیں ہوتے وہ عیشِ امروز میں آنے والی آزمائشوں کا پرتو دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ع

شبِ ما صبح شود روزِ تو فردا دارد

(ہماری رات کو صبح ہونا ہے اور تمھارے آج کو بھی کل میں تبدیل ہونا ہے)

یوں تو آج اور کل محض ان فرضی گرہوں کے نام ہیں جو ہم نے اپنی سہولت کے لئے زمانے کی دوڑ میں لگا رکھی ہیں لیکن بہ ہر حال ہر آغاز کوئی نہ کوئی انجام

ضرور رکھتا ہے اور ہر آغاز کرنے والا انجام کی خوش گواری اور کامیابی کا تمنائی بھی ہوتا ہے......

کامیابی کی تمنا ایک فطری تمنا ہے، یہ نہ ہو تو زندگی بے رونق ہو جائے۔ میں، آپ ہم سب کامیابی کے خواہش مند ہیں، یہ خواہش ہمیں متحرک رکھتی ہے، ذات، مال، جائداد، اولاد، روزگار میں کامیابی کی تمنا بڑی سے بڑی کامیابی کی آرزو! لیکن کیا یہ تمام کامیابیاں بڑی کامیابیاں ہیں؟ ...... دنیا میں نام کما لینے، آسودگی پا لینے، دولت، شہرت، عزت حاصل کر لینے کو بڑی کامیابیاں کہا جا سکتا تھا اگر ان میں دوام ہوتا...... اگر یہ آنکھیں موند لینے کے بعد بھی انسان کے ساتھ رہتیں، لیکن یہاں تو حالت یہ ہے کہ یہ کامیابیاں بہت سی صورتوں میں، زندگی میں بھی وفا نہیں کرتیں، مرنے کے بعد کا کیا ذکر......؟ معلوم ہوا کہ کامیابی کے یہ پیمانے بہت چھوٹے ہیں...... ہمیں کامیابی کے برتر اور بہتر پیمانوں کی ضرورت ہے۔۔ جو ہمیں صرف اس دنیا میں نہیں۔ خواب سے بیدار ہو کر کھلنے والے منظر نامے میں بھی کامیاب بنائیں۔ یہ پیمانے کون فراہم کر سکتا ہے۔۔ خالق، اپنی تخلیق کی صفات کے ساتھ اس کی ضروریات سے بھی واقف ہوتا ہے۔۔ ہمارے خالق نے ہماری اس ضرورت کو پورا کرتے ہوئے ہمیں ایسی کامیابی کے راز سے بھی واقف کر دیا ہے، جو بڑی کامیابی ہے، جس میں دوام ہے، جو دونوں جہانوں کی مسرّتوں کو محیط ہے۔۔ اسے اس نے ''فوزِ عظیم'' کا نام دیا ہے اور اس کے لئے ایک معیار مقرر کر دیا، جو لوگ اس معیار پر پورے اتریں گے انھیں ضرور فوزِ عظیم عطا کی جائے گی، یہ اس کا وعدہ ہے۔۔ پکا وعدہ،

جو قدیم سے ہے اور جس کا ذکر اس نے توریت، انجیل اور قرآن حکیم میں تواتر سے کیا ہے اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو۔ [1]

متی کی انجیل [2] اور توریت کتاب استثنا [3] میں باوجود تحریف ہو جانے کے قرآن مجید کی سورتوں آل عمران [4] النسا [5] المائدہ [6] التوبہ [7] یونس [8] النور [9] الاحزاب [10] الدخان [11] الجاثیہ [12] اور البروج [13] میں اس وعدے کا ذکر موجود ہے۔

اس منزل کو پانے کے لئے اللہ نے جو معیار مقرر کیا، وہ دوستی کا معیار ہے۔ اللہ سے دوستی کا: اللہ کا دوست کون ہے۔ وہ جو اس پر ایمان لائے اور تقویٰ کی روش اختیار کرے، وہ جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑ دیے، جان و مال سے جہاد کیا جو ایک دوسرے مومن کے رفیق کار بنے، نماز قائم کی، زکوٰۃ دی اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی۔ [14]

ایسے دوستوں کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں بشارت ہی بشارت ہے، دنیا کی مسرّتوں کے ساتھ ان کے لئے آخرت میں ایسے باغ تیار کئے گئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی [15]

یہ عظیم الشان کامیابی جن صفات کا صلہ ہے وہ اس سودے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں جو اللہ نے اپنے مومن بندوں سے کر لیا ہے اور جس میں اس نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لئے ہیں۔ [16]

یوں تو انسان کا سب کچھ اللہ ہی کا عطا کردہ ہے لیکن انسان اس دنیا میں اپنے ارادے اور انتخاب میں آزاد ہے، اللہ کی بے پایاں عنایات کا اعتراف کرنے یا انکار کرنے میں بھی آزاد ہے ۔۔ اس خریداری کا مطلب دراصل انسان کی اس ارادے اور انتخاب سے دستبرداری ہے ۔۔ وہ انتخاب و استرداد میں اپنے محدود اور ناقص پیمانوں کو چھوڑ کر اللہ کے پُر حکمت، محکم اور نفع رساں پیمانوں کو اختیار کرلے، وہ نعمتوں کی امانت کا امین بن جائے ۔۔ یہ انتخاب زندگی کے سارے نظام اور ترتیب کو تبدیل کر دیتا ہے، یہ دراصل سامنے نظر آنے والے فوائد کے مقابلے میں پردہ غیب میں موجود فوائد کو ترجیح دینے کا نام ہے۔ اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں گم کر دینے، زبانی اقرار کے ساتھ فی الواقع اللہ کو متصرّف حقیقی جاننے کا نام ہے ۔۔ لیکن یہ سب کچھ ایسا نہیں ہے کہ زندگی میں ایک بار اس کا اظہار یا اقرار کر دیا جائے تو کافی ثابت ہو اور عظیم کامیابی کی اہلیت پیدا ہو جائے ۔۔ جی نہیں اس سب کچھ کو ایک مرحلے پر اختیار کرنا اور دوسرے مرحلے پر اس کی نفی کر دینا، منافقت کہلاتا ہے، یہ تو ساری زندگی، زندگی کی آخری سانس تک کا سودا ہے، منافقت سے مداومت کا امتیاز، سفر کی تکمیل پر ہوتا ہے جب تک وہ جنس جس کا سودا کیا جائے بہ تمام وکمال خریدار کے حوالے نہ کر دی جائے اس کی قیمت ادا نہیں کی جاتی (گو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی صلہ عطا فرماتا ہے) لے ارادے اور اختیار کو اللہ کی رضا کے تابع کر دینے کا کامل ثبوت تو سانسوں کے مکمل ہو جانے پر ملے گا اور پھر اس کا صِلہ ۔۔ ایک عظیم انعام کی شکل

میں ۔۔ ادا کر دیا جائے گا۔۔تب دنیا سے رخصت ہونے والوں کو زندگی اور اللہ کی رضا کے لئے زندگی سے دستبرداری کا لطف معلوم ہو جائے گا ۔

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

حوالے:

۱۔ التوبہ ۱۱۱
۲۔ متی ۱۹:۲۹ (عہد نامہ جدید)
۳۔ استثنا ۶:۴،۵
۶:۳۲ (عہد نامہ قدیم)
۴۔ آیت ۱۸۵
۵۔ " ۱۳
۶۔ " ۱۱۹
۷۔ " ۱۰۰،۱۱۱
۸۔ " ۶۴
۹۔ " ۵۲
۱۰۔ " ۷۰،۷۱
۱۱۔ " ۵۷
۱۲۔ " ۳۰
۱۳۔ " ۱۱
۱۴۔ یونس ۶۴
۱۵۔ التوبہ ۸۹(یونس ۶۴،۶۳)
۱۶۔ التوبہ ۱۱۱
۱۷۔ یونس ۶۴

تمنّا و تشکّر

آئینۂ کردار کی دھندلاہٹوں کا شکار ہوتے ہوئے مصنف نے اپنے باطن کے آئینے کو جلا بخشنے کی جو کوشش کی تھی بفضلہٖ اسے مقبولیت کی خلعت ملی اور ابھی جب کہ اس کتاب کی اشاعتِ اوّل کی سیاہی بھی تازہ ہے، پنجاب یونی ورسٹی کے شیخ زاید اسلامی مرکز سے اسے دوسری بار شائع کیا جا رہا ہے، یہ اشاعت اللہ کریم کے فضل اور قارئین کی پسندیدگی کے بغیر ممکن نہ تھی۔

اس موقع پر میں اپنے قارئین کے ساتھ وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی لیفٹیننٹ جنرل (ر) ارشد محمود اور ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامی مرکز محترمہ پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ کا بھی شکر گزار ہوں جن کی توجہ اس کتاب کی اشاعتِ ثانی کا باعث بن رہی ہے۔

خوانندگانِ کرام سے التماس ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ زندگی ضلّ سعيهم في الحيوة الدّنيا (الکهف: ۱۰۴) کا مصداق بننے سے بچ جائے، پُرارزش لمحے بامعنی سرگرمیوں میں صرف ہوں، احقر مصنف کی قلمی کاوشیں بارگاہِ صمدیت میں مقبول ہوں، آبی پرندوں کی طرح دریا میں رہتے ہوئے بھی خشک پَر رہنے کی توفیق ارزانی ہو اور انجام بخیر ہو۔ آمین!

۸/ اگست ۲۰۰۳ء

زاہد منیر عامر

۵۸/ ای، پنجاب یونی ورسٹی

قائداعظم کیمپس، لاہور

ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی بعض دوسری کتابیں

۱۔	جہات (تحقیقی مقالات)	۲۰۰۰ء
۲۔	لمحوں کا قرض	۱۹۸۹ء
۳۔	مکاتیب ظفر علی خان	۱۹۸۶ء
۴۔	اپنی دنیا آپ پیدا کر	۱۹۸۹ء
۵۔	اقبال شناسی اور نوید صبح	۱۹۹۰ء
۶۔	نقوش جاوداں	۱۹۸۸ء
۷۔	مولانا تاج محمود۔ حالات ومکتوبات	۱۹۸۵ء
۸۔	مولانا ظفر علی خان۔ کتابیات	۱۹۹۳ء
۹۔	علامہ اقبالؒ کی تاریخ ولادت۔ایک مطالعہ (باشتراک)	۱۹۹۴ء
۱۰۔	میر سوز۔سوانح اور شخصیت	۲۰۰۰ء
۱۱۔	پہلی سحر کے رنگ (شعری مجموعہ)	۱۹۸۹ء
۱۲۔	تراعکس آئنوں میں (شعری مجموعہ)	۲۰۰۰ء
۱۳۔	لمحے کی روشنی	۲۰۰۱ء
۱۴۔	ارمغانِ شیرانی (باشتراک)	۲۰۰۲ء